بہار

میں

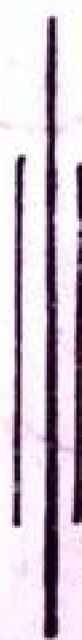
اردو کی صوفیانہ شاعری

محمد طیب ابدالی

بہار

میں

اُردو کی صُوفیانہ شاعری



محمد طیبؔ ابدالی

اس کتاب کی اشاعت میں بہار اردو اکادمی کا جزوی مالی تعاون شامل ہے

طابع ـــــ اسرار کریمی پریس۔ الہ آباد
کتابت ـــــ قمر نظامی، معروف گنج، گیا
بار اوّل ـــــ ستمبر ۱۹۸۰ء
ناشر ـــــ مصنّف
تعداد ـــــ ایک ہزار

قیمت
پچاس روپئے

●

ـــ ملنے کے پتے ـــ

- محمد طیّب ابدالی، دار الشرف۔ باری روڈ، گیا
- مکتبہ صوفیا، خانقاہ اسلام پور، اسلام پور، ضلع نالندہ
- بک امپوریم، سبزی باغ، پٹنہ ۴
- استار بک ڈپو، ۴۰ اچاریہ جگدیش بوس روڈ، کلکتہ ۱۴

اِنتساب

اُن مقدّس صُوفیائے کرام

کے

نام

جن کے صوفیانہ افکار و اقدار نے اُردو زبان و ادب کو منزّہ اور مصفّا کیا۔

خاکپائے درویشاں

مُحمّد طیّب ابدالی

فہرست مضامین

عرضِ حال

خطّۂ صوبہ بہار مردم خیز بھی ہے اور گمنام پسند بھی ۔ ساتویں صدی ہجری ہی سے یہاں بزرگانِ دین کا مبارک قدم آیا اور عملی اور علمی دونوں اعتبار سے رشد و ہدایت کی ترویج و اشاعت ہوتی رہی ۔ یہاں کے بزرگانِ دین اسی عہد سے صوفیانہ اور عارفانہ خیالات کو تصنیف و تالیف کی شکل میں پیش کرتے رہے ۔ فارسی زبان و ادب کے ساتھ ساتھ اُردو کی ابتدائی نشو ونما میں سرگرم عمل رہے ۔

شمالی ہند میں اگر ایک طرف حضرت فریدالدین گنج شکرؒ، حضرت بوعلی قلندر پانی پتیؒ اور حضرت امیر خسروؒ کے نقرے، دوہے، پہیلیاں اور دو سخنے مشہور ہو رہے تھے تو اسی عہد میں صوبۂ بہار میں حضرت مخدوم جہاں شرف الدین یحییٰ منیریؒ کے نقرے، خالنامے، گجمندرے بھی شرف قبولیت حاصل کر رہے تھے ۔ تحقیق و جستجو نے اس حقیقت کو بھی سامنے لایا ہے کہ حضرت مخدوم جہاںؒ کے جانشین مولانا مظفر بلخیؒ اور ان کے سجّادگان نے بھی اس روشنی کی لو کو زیادہ تیز کیا اور ان کے دوہے اپنی قدامت اور اہمیت کے اعتبار سے ناقابلِ فراموش ہیں اور اس فریضے کو تقریباً بہار کی تمام خانقاہوں کے سجّادگان نے بڑے اخلاص اور محبت سے پروان چڑھایا ۔ اس حقیقت کو بھی فراموش نہیں کیا جا سکتا کہ صوبہ بہار میں صوفیانہ شاعری انہیں خانقاہوں کے سجّادگان کی رہونِ منّت ہے ۔ اگر تحقیق و جستجو کی جائے تو پورے شمالی ہند میں اُردو کے جتنے صوفی

شعراء نظر آتے ہیں ان میں نصف سے زیادہ صرف صوبہ بہار کے صوفی شعراء
ہیں۔ اس لیے یہ میرا فرض تھا کہ اس حقیقت کو بھی پیش کروں کہ اُردو کے
ناقدین اور محققین نے اپنی نافرض شناسی کے سبب ان صوفی شعراء کو
نظر انداز کیا ہے جو تاریخ ادب اُردو میں اور بالخصوص صوفیانہ شاعری
میں بڑی عظمت اور اہمیت کے حامل ہیں۔ میں ان صوفی شعراء کے کارناموں
کو آپ کے سامنے پیش کر رہا ہوں۔ تاکہ قارئین انصاف کا دامن ہاتھ
سے نہ جانے دیں۔

آج سے چار سال پہلے ۱۹۸۲ء میں میری تصنیف "اُردو میں
صوفیانہ شاعری" اشاعت پذیر ہو کر شرف قبولیت حاصل کر چکی ہے۔
میں نے ہندوستان کے ان نمائندہ صوفی شعراء کو منظر عام پر لایا ہے اور
اور ان کے نمونۂ کلام بھی پیش کیے ہیں۔ اِس میں بھی باوجود تحقیق و جستجو کے
صوبۂ بہار ہی کے خدمات نمایاں نظر آتی ہیں۔ میری حیرت کی انتہا اس
وقت ہوئی جب یہ حقیقت سامنے آئی کہ صوفیانہ تغزّل میں شمالی ہند میں
صوبہ بہار کو شرفِ تقدم حاصل ہے اور شاہ کمال علی کمالؔ دیوروی
(۱۰۹۰ھ تا ۱۲۱۵ھ) سے پہلے شمالی ہند میں کوئی دوسرا صوفی
شاعر نظر نہیں آتا۔ آپ کے بعد ہی حضرت مرزا مظہر جانجاناں
(۱۱۱۳ھ تا ۱۱۹۵ھ)، خواجہ میر درد (۱۱۳۲ھ تا ۱۱۹۹ھ)
نظر آتے ہیں۔ پھر جس کثرت سے صوفی شعراء بہار میں نظر آتے ہیں،
دوسری جگہ نہیں۔ اس لیے کہ یہاں کی خانقاہوں کے سجادگان بذات
خود صوفی شاعر تھے اور اُردو کی ترویج و اشاعت اپنے عارفانہ کلام
کے ذریعہ کرتے رہے۔ یہ جذبۂ کامل ان کا طرۂ امتیاز رہا ہے۔ میں نے

اپنی اس تصنیف کی ترتیب میں تصوف کے صرف ان نمائندہ شعراء کو لیا ہے جن پر تحقیقی کام ہو چکا ہے یا ہو رہا ہے۔ میں نے شعراء کے انتخاب و ترتیب میں صرف قدامت اور سن وسال کا لحاظ قائم رکھا، ان کے منصب اور عظمت و بزرگی کی ترتیب فہرست میں جگہ نہیں دی ہے۔

فہرست مضامین میں، میں نے اس میں "بہار کی خانقاہیں" کا اضافہ کیا۔ اور وہ میری تصنیف "جادۂ عرفاں" سے ماخوذ ہے۔ اس کو پیش کرنے کی میری غرض و غایت صرف اتنی ہے کہ بہار کی یہ خانقاہیں علمی اور عملی دونوں اعتبار سے ممتاز رہی ہیں۔ یہ خانقاہیں تہذیبی اور سماجی اصلاح کے علاوہ آپس میں اتحاد و اتفاق، تصنیف و تالیف، اخوت و بھائی چارگی کے لیے کبھی پیش پیش تھیں۔ لیکن اب ان مراکز میں زندگی کی روشنی میں وہ چمک اور دمک نہیں رہی۔ پھر بھی وقتاً فوقتاً ان ہی خاکستروں میں کوئی دبی ہوئی چنگاری چمک اٹھتی ہے، اور ان برسے ہوئے بادلوں کی خوابیدہ بجلیاں شب تار میں لہرانے لگتی ہیں۔

میں اپنے ان تمام محسنین اور کرم فرماؤں کا شکریہ ادا کرنا اپنا فرض سمجھتا ہوں جنھوں نے مجھے مفید مشوروں سے نوازا ہے اور میری ہمت افزائی کی ہے، اور اپنے ان تمام رفقاء اور شاگردوں کو بھی فراموش نہیں کر سکتا جنھوں نے کسی نہ کسی طرح میری اس تصنیف میں تعاون کیا ہے بالخصوص اپنے شاگرد عزیز ڈاکٹر طارق فاطمی اور

عزیزی شہزاد انجم اپنے خلوص وسعادت مندی کی وجہ سے میرے شکریے کے مستحق ہیں۔ بہار اردو اکادمی کا بھی شکرگزار ہوں جنھوں نے مالی تعاون سے اس کتاب کی اشاعت میں میری مدد کی۔ "بہار میں اردو کی صوفیانہ شاعری" زیورِ طبع سے آراستہ ہو رہی ہے۔ مجھے اس کا احساس ہے کہ صفحات کی محدود پابندی کی وجہ سے میں نے اِس ایڈیشن میں بہار کے بعض گراں قدر صوفی شعرا، کو جگہ نہیں دی۔ انشاءاللہ دوسرے ایڈیشن میں اس کا خیال رکھا جائے گا۔

میں تمام اہلِ علم اور اہلِ ذوق سے توقع رکھتا ہوں کہ وہ میری خامیوں اور کوتاہیوں کی نشان دہی کریں گے تاکہ آئندہ اس کی اصلاح ہو سکے۔

خاکپائے درویشاں

محمد طیب ابدالی

۱۲ر ستمبر ۱۹۸۸ء

بسم اللہ الرحمٰن الرحیم

تصوّف کی حقیقت

یہ حقیقت ہے کہ اسلامی تہذیب میں صوفیت کی ابتدا خود آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کی ذات بابرکات سے ہوئی۔ قرآن مجید میں اس حقیقت کی نشان دہی اس آیت کریمہ سے ہوتی ہے :-

رَبَّنَا وَابْعَثْ فِيهِمْ رَسُولًا مِّنْهُمْ يَتْلُوا عَلَيْهِمْ آيَاتِكَ وَيُعَلِّمُهُمُ الْكِتَابَ وَالْحِكْمَةَ وَيُزَكِّيهِمْ ط [۱]

اے میرے رب! ان ہی میں سے ایک رسول ان میں بھیج جو تیری آیتیں تلاوت فرمائے اور کتاب و حکمت کی باتیں سکھائے اور ان کا تزکیہ کرے۔

گویا تین منزلیں ہیں: (۱) تعلیم کتاب (۲) حکمتِ کتاب کی بصیرت (۳) اور تزکیۂ نفس و روح۔ اس کے بغیر ذہنی بلندی کے لطائف شریعت تک رسائی نہیں ہو سکتی اور دراصل لطائفِ شریعت ہی صوفیت ہے۔ دوسری جگہ آیا ہے :-

وَالَّذِينَ آمَنُوا أَشَدُّ حُبًّا لِلَّهِ [۲]

اور ایمان والوں کو اللہ کے برابر کسی کی محبت نہیں۔

ایک جگہ اور فرمایا ہے کہ :-

قُلْ إِنْ كُنْتُمْ تُحِبُّونَ اللَّهَ فَاتَّبِعُونِي يُحْبِبْكُمُ اللَّهُ [۳]

(اے رسول ﷺ) آپ فرما دیجیے کہ لوگو! اگر تم لوگ اللہ کو دوست رکھتے ہو تو میری پیروی کرو اللہ تم کو چاہنے لگے گا۔

---

[۱] پ ۱، ع ۱۵، سورہ بقرہ۔ [۲] پ ۲۔ ع ۴، سورہ بقرہ [۳] پ ۳، ع ۱۴، سورہ آل عمران

اسی طرح حبِ الٰہی کا نظریہ اسلامی تصوف میں آیا۔ اسلامی تصوف کے حامل کی حیثیت قرآن مجید میں موجود ہے۔ قرآن حکیم نے اعلیٰ درجے کے مومن کی خصوصیات مختلف صورتوں میں بیان کی ہیں۔ کہیں اس مردِ کامل کو "عباد الرحمٰن" فرمایا اور کہیں "مومن" کہیں اسے "متقی" کہا تو کہیں "مسلم" کہیں "مقربین" کہیں "زہاد"۔ کئی مختلف پیرائے میں انسان کی ایک مثالی سیرت پیش کی گئی ہے۔ خود قرآن حکیم میں اللہ تعالیٰ فرماتا ہے کہ:-

وَعِبَادُ الرَّحْمٰنِ الَّذِيْنَ يَمْشُوْنَ عَلَى الْاَرْضِ هَوْنًا وَّاِذَا خَاطَبَهُمُ الْجٰهِلُوْنَ قَالُوْا سَلٰمًا ○ وَالَّذِيْنَ يَبِيْتُوْنَ لِرَبِّهِمْ سُجَّدًا وَّقِيَامًا ○ وَالَّذِيْنَ اِذَآ اَنْفَقُوْا لَمْ يُسْرِفُوْا وَلَمْ يَقْتُرُوْا وَكَانَ بَيْنَ ذٰلِكَ قَوَامًا ○ وَالَّذِيْنَ لَا يَدْعُوْنَ مَعَ اللّٰهِ اِلٰهًا اٰخَرَ وَلَا يَقْتُلُوْنَ النَّفْسَ الَّتِيْ حَرَّمَ اللّٰهُ اِلَّا بِالْحَقِّ وَلَا يَزْنُوْنَ ۚ وَمَنْ يَّفْعَلْ ذٰلِكَ يَلْقَ اَثَامًا ○ وَالَّذِيْنَ لَا يَشْهَدُوْنَ الزُّوْرَ وَاِذَا مَرُّوْا بِاللَّغْوِ مَرُّوْا كِرَامًا ○ وَالَّذِيْنَ اِذَا ذُكِّرُوْا بِاٰيٰتِ رَبِّهِمْ لَمْ يَخِرُّوْا عَلَيْهَا صُمًّا وَّ

اور رحمٰن کے سچے بندے وہ ہوتے ہیں جو زمین پر آرام سے چلتے ہیں (تکبر سے نہیں چلتے) ان میں سلامت روی پائی جاتی ہے اور جاہل جب ان سے مخاطب ہوتے ہیں تو ان کے لئے بھی سلامتی کی دعا کرتے ہیں۔ وہ اپنے رب کے لئے راتیں مسجدوں میں کھڑے ہوکر گزارتے ہیں۔ (اور دوسری جگہ فرماتا ہے کہ) اور وہ اللہ کے بندے ایسے ہوتے ہیں کہ جب خرچ کرتے ہیں تو فضول خرچی سے کام نہیں لیتے، اور نہ بخل کرتے ہیں اور ان کا خرچ ان دونوں حالتوں میں درمیانی ہوتا ہے اور وہ لوگ ایسے ہوتے ہیں کہ اللہ تعالیٰ کے کسی اور کو معبود نہیں پکارتے اور نہ کسی جان کو جسے اللہ تعالیٰ نے حفاظت بخشی ہو وہ قتل کرتے ہیں سوائے شرعی حق کے اور نہ زنا کرتے ہیں۔ وہ

عُمْيَانًا ○ وَالَّذِيْنَ يَقُوْلُوْنَ رَبَّنَا هَبْ لَنَا مِنْ اَزْوَاجِنَا وَذُرِّيّٰتِنَا قُرَّةَ اَعْيُنٍ وَّ اجْعَلْنَا لِلْمُتَّقِيْنَ اِمَامًا ○ [۱]

جھوٹی گواہیاں نہیں دیتے اور جب لغو باتوں کے پاس سے گذرتے ہیں تو بزرگانہ طور پر اور جب انہیں ان کے رب کی آیتیں یاد دلائی جاتی ہیں تو ان سے بہروں اور اندھوں کا معاملہ نہیں کرتے وہ یہ دعا کرتے رہتے ہیں کہ اے ہمارے رب ہماری بیویوں اور اولاد کی طرف سے آنکھوں میں ٹھنڈک عطا فرما اور ہمیں متقیوں کا امام بنا۔

واضح انداز میں اللہ تعالیٰ اولیاء اللہ کی تعریف سورۂ یونس میں اس طرح کرتا ہے:

اَلَآ اِنَّ اَوْلِيَآءَ اللّٰهِ لَا خَوْفٌ عَلَيْهِمْ وَلَا هُمْ يَحْزَنُوْنَ ○ اَلَّذِيْنَ اٰمَنُوْا وَكَانُوْا يَتَّقُوْنَ ○ لَهُمُ الْبُشْرٰى فِى الْحَيٰوةِ الدُّنْيَا وَفِى الْاٰخِرَةِ ؕ لَا تَبْدِيْلَ لِكَلِمٰتِ اللّٰهِ ؕ ذٰلِكَ هُوَ الْفَوْزُ الْعَظِيْمُ ○ [۲]

سُنو، اللہ کے اولیاء کے لئے کسی خوف اور رنج کا موقع نہیں، یہ وہ لوگ ہیں جو ایمان لائے اور تقویٰ کا رویہ اختیار کیا، دنیا اور آخرت دونوں زندگیوں میں ان کے لئے بشارت ہی بشارت ہے۔ اللہ کی باتیں بدل نہیں سکتیں۔ یہی بڑی کامیابی ہے۔

حدیث شریف میں بھی تصوف کو احسان کہا گیا ہے اور یہ صفت جو اس حدیث شریف میں بیان کی گئی ہے وہ اللہ کے ان برگزیدہ بندوں کی ہے جو صوفی کے نام سے عہد قدیم میں مشہور ہوئے۔ حضرت جبرئیل نے نبی اکرم صلی اللہ علیہ وسلم سے چند سوالات کئے تھے اور اس کے جوابات بھی دیئے، وہ یہ ہیں :۔

---

[۱] سورہ فرقان، ع ۴۔ پ ۱۹ [۲] سورہ یونس، ع ۱۲۔ پ ۱۱

قال فاخبرنی عن الاحسان	مجھے احسان کے بارے میں بتائیے ،
قال ان تعبد اللّٰہ	حضور نے فرمایا احسان یہ ہے کہ تم اللہ
کانک تراہ فان	کی عبادت اس طرح کرو جیسے تم اسے
لم تکن تراہ فانہ	دیکھ رہے ہو اور اگر تم اسے نہیں دیکھ
یراک ۔ [۱]	رہے ہو تو وہ یقیناً تمہیں دیکھ رہا ہے ۔

حضرت شیخ قاضی علا شطاری رحؒ نے اپنے ملفوظ "معدن الاسرار" میں ارشاد فرمایا :۔ "الشریعۃ کالسفینۃ والطریقۃ کالبحر والحقیقۃ کالدّر فمن لم یصل الی البحر فمن لم یصل الی الدر" وکما جاء فی الحدیث النبی علیہ السلام الشریعۃ اقوالی والطریقۃ افعالی والحقیقۃ احوالی۔" [۲]

ترجمہ :" شریعت کشتی کی طرح ہے اور طریقت دریا ہے اور حقیقت موتی ہے پس جس شخص کی رسائی دریا تک نہ ہوئی وہ موتی تک نہ پہنچا اور جیسا کہ حدیث نبی علیہ السلام میں مذکور ہے کہ میرا قول شریعت ہے اور میرا فعل طریقت اور میرے احوال حقیقت ہیں ۔"

یہ وہ سورتیں اور احادیث ہیں جن سے تصوف کی ابتدا ہوئی ہے ۔ اسلام میں ابتدا ہی سے تصوف عملی صورت میں موجود تھا لیکن دوسرے علوم مثلاً علم حدیث ، علم تفسیر اور علم فقہ کی طرح اس نے بھی علمی اور فنی شکل زمانہ مابعد میں حاصل کی لیکن سب کا منبع قرآن مجید اور حدیث شریف ہی ہے اور سب کا عملی وجود آں حضرت صلی اللہ علیہ وسلم اور صحابہ کرام رضوان اللہ علیہم اجمعین کے عہد مبارک میں پایا جاتا ہے ۔ اس حقیقت کی وضاحت معدن الاسرار میں اس طرح کی گئی ہے :۔

"بدانکہ در خبر است کہ پیغمبر علیہ السلام	ترجمہ : معلوم ہو کہ حدیث میں مذکور
در مسجد خود یک زاویہ متعین کردہ بود۔	ہے کہ پیغمبر علیہ السلام نے مسجد نبوی میں

---

[۱] مسلم شریف [۲] معدن الاسرار ملفوظ حضرت قاضی علا شطاری رحؒ فصل چہارم وسوم

وازصحابہ یک طائفہ راکہ سالکان
راہ طریقت .بودند برگزیدہ بعضے
میاں ایشاں پیراں بودند چوں
ابوبکرؓ وعمرؓ وعثمانؓ وعلیؓ
وسلمانؓ وابوذرؓ وعمارؓ۔
مصطفیٰ صلی اللہ علیہ وسلم ایشاں
را بہ اوقات خلوت درآں زاویہ
می نشاندی و با ایشاں اسرار
گفتی کہ صنادید عرب و عوام۔
صحابہ آں رافہم نکردو ایں جماعت
گاہی ہفتادتن بودے و گاہے
کم و چوں کسے را زمیاں ایشاں
اکرام کردے ردائے مبارک
یا پیراہن بدو دادے و ایں
طائفہ بگزارد و حقوق شریعت
چناں. بودند اگر تمام دُنیا
بدیشاں دہند و نعیم عقبیٰ و بہشت
ایشاں را بخشند یا بلائے تمام
عالم و محنت برائے شاں باشند
نعمت دنیا و آخرت بہ بیگانان
گزارند، بلا و محنت خود قبول کنند۔"[1]

ایک گوشہ مقرر کر دیا تھا اور صحابہ کرام
کی ایک جماعت جو راہ طریقت پر چلنے
والی تھی اور اس راہ کو اختیار کئے ہوئے
تھی بعد ان لوگوں کے درمیان بزرگ تھے
جیسے ابوبکرؓ، عمرؓ، عثمانؓ، علیؓ،
سلمانؓ، ابوذر غفاریؓ اور بعض بوڑھے
اور ادھیڑ عمر کے تھے جیسے معاذؓ، بلالؓ، ابو
ذر غفاریؓ اور عمارؓ۔ حضرت محمد مصطفیٰ
صلی اللہ علیہ وسلم ان لوگوں کو اوقات تنہائی
میں اسی گوشہ میں بٹھاتے اور ان لوگوں سے
اسرار و رموز کی باتیں کرتے کہ عرب کے سردار اور
عام صحابہ اس کو نہیں سمجھتے اور یہ جماعت
ستر افراد پر مشتمل رہتی اور کبھی زیادہ اور کبھی
کم اور جب کبھی ان لوگوں میں سے کسی کو انعام
و اکرام کرتے تو اپنی چادر مبارک یا اپنا
لباس مبارک ان کو دے دیتے اور یہ
جماعت شریعت کے حقوق ادا کرنے میں ایسی
تھی کہ اگر تمام دنیا ان کو دے دی جاتی اور
آخرت کی نعمتیں اور بہشت ان لوگوں کو بخش
دی جاتیں یا تمام دنیا کی مصیبتیں اور محنت
ان لوگوں کو دی جاتیں تو وہ لوگ دُنیا اور

---

[1] معدن الاسرار ملفوظ حضرت قاضی علا شطاری فصل چہل وچہارم در بیان طریقت

آخرت کی نعمتیں دوسروں کو دے دیتے اور
مصیبت اور محنت خود قبول کر لیتے۔"

موصوف نے شریعت، طریقت اور حقیقت پر مختصر مگر جامع روشنی ڈالی ہے
"دربیان مراتب و معانی حقیقت" میں فرماتے ہیں کہ :۔

"بداں کہ حقیقت ہمہ احوال سالکان است چوں سالک بگزارد حقوق طریقت بہ ہدایت خاص رسد و احوال حقیقت مکشوف وے گردد"[1]

ترجمہ: معلوم ہو کہ حقیقت سالکوں کی ان تمام حالتوں کو کہتے ہیں کہ جب سالک حقوق طریقت ادا کرے ہدایت خاص میں پہنچے اور حقیقت کے حالات اس پر منکشف ہوں۔"

پھر آگے اس کی وضاحت کرتے ہیں کہ :۔

"فالحاصل صحت حال اعمال ظاہر را شریعت نامند و صحت اعمال باطن را طریقت خوانند و صحت حال و ارادت را حقیقت شناسند و علماء ظاہر گویند شریعت حقیقت است۔ حقیقت شریعت فرق نہ کنند ایں پیش اہل طریقت غلط است زیراچہ اقامت علم حقیقت بے اقامت شریعت زندقہ است۔ اقامت علم شریعت بے اقامت حقیقت نفاق۔ ہر کہ ہنوز شریعت نہ رفتہ است وے را با طریقت آشنائی نیست و ہر کہ با طریقت آشنا نہ شد آں بیچارہ را با حقیقت چہ گذر و چہ کار۔"

ترجمہ: "اور باطن اعمال کی صحیح حالتوں کا لوگوں نے شریعت نام رکھا ہے اور باطن اعمال کے صحیح حال کو طریقت کہتے ہیں اور ارادہ کے صحیح حال کو حقیقت سمجھتے ہیں۔ علمائے ظاہر شریعت کو حقیقت کہتے ہیں، اور شریعت و حقیقت میں فرق نہیں کرتے اور یہ اہل طریقت کے نزدیک غلط ہے کیوں کہ علم حقیقت کا قیام شریعت کے بغیر زندقہ ہے۔ علم شریعت کا قیام حقیقت کے بغیر نفاق ہے۔ جو شریعت پر کبھی نہ چلا اسے طریقت سے کیا واسطہ اور جس کو طریقت سے واسطہ نہ ہو اس بیچارے کو حقیقت سے کیا سروکار۔"

---

[1] معدن الاسرار فصل چہل و پنجم

حضور مقبول صلی اللہ علیہ وسلم اور آپ کے صحابہ کرام کی زندگیاں بالکل مومنانہ اور صوفیانہ رنگ میں رنگی ہوئی تھیں۔ اصحاب صفہ کے علاوہ بھی جتنے اصحاب تھے سب صدق و صفا، تسلیم و رضا اور اخلاص و وفا میں آگے بڑھے ہوئے تھے۔ یو نورانی کیفیت صرف حضرت علی کرم اللہ وجہہ میں ہی ظاہر نہیں ہوئی بلکہ حضرت ابوبکر صدیقؓ، حضرت عمر فاروقؓ، حضرت عثمان ذوالنورینؓ، حضرت سلمان فارسیؓ اور حضرت عمارؓ پر بھی طاری ہوئی۔

صحابی کے بعد تابعی کا دور آتا ہے اس دور میں کچھ ایسے تابعین بھی تھے جنھوں نے اپنے اقوال و افعال سے تصوف پر گہرا اثر ڈالا۔ ان میں حضرت حسن بصریؒ اور حضرت اویس قرنیؒ مشہور ہیں۔ آپ کے بعد تبع تابعین کا دور آتا ہے۔ اس میں حضرت عبدالواحد بن زیدؒ، حضرت مالک بن دینارؒ، حضرت حبیب عجمیؒ کے نام قابل ذکر ہیں۔ اس دور میں اسلامی تصوف کو بہت فروغ حاصل ہوا لیکن ان سب باتوں کے باوجود تصوف فن اور علم کی حیثیت سے ایک منفرد مقام حاصل نہ کر سکا اور صوفی کے لقب سے کوئی مشہور نہ ہو سکا۔

تعریفاتِ تصوّف

علم تصوف کا اگر جائزہ لیا جائے تو یہ حقیقت آشکارا ہوتی ہے کہ تصوف ایک ایسا مسلک ہے جس کی آج تک کوئی جامع تعریف نہیں ہو سکی ہے اس لئے کہ یہ ایک ذاتی، تجرباتی، ذوقی اور وجدانی شے ہے۔ ایسی حالت میں تمام اصحاب رائے کا اتفاق ایک ہی بات پر ہونا محال ہے کیونکہ ہر ایک کا ذوق وجدان مختلف ہے۔ جس کا ذوق جتنا زیادہ لطیف ہوگا اتنا ہی زیادہ حقیقت الامر کو سمجھ سکتا ہے۔ اس کے علاوہ مسلک تصوف نے کسی زمانے میں کوئی واحد اور مستقل صورت اختیار نہیں کی۔ ہر عہد میں اس کی شکل بدلتی رہی۔ اوائل اسلام میں تصوف محض زہد و تقویٰ کی صورت میں موجود تھا۔ زمانہ مابعد میں اس میں برابر مختلف رنگوں کی آمیزش ہوتی رہی اس لئے اس کی کوئی جامع تعریف ممکن نہیں۔ تاہم صوفیائے کرام نے اپنے ذوق و وجدان کے مطابق اس کی جو تعریفیں کی ہیں ان میں چند پیش کی جاتی ہیں۔ تاکہ ان کے ذریعہ

تصوف کے مفاہیم و مطالب پر روشنی پڑ سکے۔

حضرت شیخ علی بن عثمان ہجویریؒ نے اپنی تصنیف "کشف المحجوب" میں دور قدماء کے صوفیائے عظام کی تعلیمات تصوف جمع کی ہیں ان میں سے چند ہدیۂ قارئین ہیں۔

سید الطائفہ حضرت جنید بغدادیؒ نے تصوف کی تعریف ان الفاظ میں کی ہے:۔ "التصوف نعت اقیم العبد فیہ قیل نعت العبد ام للحق فقال نعت الحق حقیقۃ ونعت العبد رسمًا۔"

"تصوف وہ صفت ہے جس میں بندہ کی اقامت کی گئی ہے (یعنی اس کا وجود ہے) لوگوں نے پوچھا کہ یہ صفت بندہ کی ہے یا حق کی ہے؟ جواب دیا کہ حقیقتًا تو حق کی ہے صورۃً بندہ کی ہے۔

حضرت ذوالنون مصریؒ کا ارشاد ہے:۔

الصوفی اذا نطق بان نطق عن الحقائق وان سکت عنہ الجوارح بقطع العلائق۔ [1]

"صوفی وہ ہے کہ جب وہ گفتار میں آتا ہے تو اس کی زبان حقائق کی ترجمان ہوتی ہے اور جب خاموش ہوتا ہے تو اس کے اعضاء قطع علائق پر زبان[1] حال سے شہادت دیتے ہیں۔"

حضرت ابوالحسن نوریؒ فرماتے ہیں کہ:۔

التصوف ترك كل حظ للنفس۔

تصوف عام حظوظ نفسانی کے ترک کا نام ہے۔

حضرت ابوبکر شبلیؒ کا ارشاد ہے:۔

الصوفی لا یری فی الدارین مع اللہ غیر اللہ

صوفی وہ ہے جو دونوں جہان میں اللہ کے سوا اور کسی کو نہیں دیکھتا۔

---

[1] حضرت صوفی منیری کے نثری کارنامے صـ۔ ۷۹ [2] کشف المحجوب صـ ۲۶۔۱۹ بحوالہ تصوف اسلام

ابو عبداللہ سہل بن عبداللہ التستری المتوفی سنہ ۲۷۳ھ کہتے ہیں :-

اصول طریقتنا سبعۃ التمسك بالکتاب والاقتداء بالسنۃ واکل الحلال وکف الاذی وتجنب المعاصی والتوبۃ واداء الحقوق۔ [1]

"ہمارے طریقہ کے اصول سات ہیں۔ کتاب اللہ کو مضبوطی سے تھامنا۔ سنت کی پیروی۔ حلال کھانا۔ اذیت رسانی سے رکنا۔ معصیتوں سے اجتناب، توبہ اور حقوق کی ادائیگی۔"

ابوالحسین احمد بن ابی الحواری (م سنہ ۲۴۰ھ) کہتے ہیں :-

من عمل عملا بلا اتباع سنۃ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم فباطل عملہ۔ [2]

"جس کسی نے اتباع سنت کے بغیر کوئی عمل کیا تو اس کا وہ عمل باطل ہوگا۔"

حضرت شیخ عبدالقادر جیلانیؒ (سنہ ۴۷۰ھ تا سنہ ۵۶۱ھ) نے اپنی تصنیف "فتوح الغیب" میں ارشاد فرمایا ہے :-

التصوف مبنی علی ثمان خصال السخا لابراھیم والرضا لاسحٰق والصبر لایوب والاشارۃ لزکریا والغربۃ لیحییٰ ولبس الصوف لموسیٰ والسیاحۃ لعیسیٰ والفقر لمحمد صلی اللہ علیہما وسلم۔

تصوف آٹھ خصلتوں پر مبنی ہے۔ سخاوت ابراہیمؑ پر، رضا اسحاقؑ پر، صبر ایوبؑ پر، مناجات زکریاؑ پر، غربت یحییٰؑ پر، خرقہ پوشی موسیٰؑ پر، تجرد عیسیٰؑ پر اور فقر محمد صلے اللہ علیہ وسلم پر۔

حضرت شیخ الاسلام زکریا انصاری کی تعریف شرح الرسالۃ القشیریہ جلد ۱ صفحہ ۶۹ پر تحریر فرماتے ہیں :-

---

[1] نتائج الافکار القدسیہ ج ۱ ص ۱۱ [2] الرسالۃ القشیریہ جلد ۱ ص ۱۲۶

التصوف علم تعرف به احوال تزکیۃ النفوس وتصفیۃ الاخلاق وتعمیر الظاہر والباطن لنیل السعادۃ الابدیۃ۔

تصوف ایک علم ہے جس سے نفوس کی پاکی، اخلاق کی صفائی اور ظاہر و باطن کی آبادی و آراستگی کے احوال معلوم ہوتے ہیں، اور اس کا مقصد ابدی سعادت کا حصول ہے۔

شیخ الشیوخ حضرت شہاب الدین سہروردی اپنی تصنیف "عوارف المعارف" میں تحریر فرماتے ہیں:

فاستوفوا جمیع اقسام المتابعۃ وحیا سنۃ اقصی الحاجات۔ [1]

(صوفیا نام ہے اس گروہ کا) جس نے ہر قسم کی پیروی رسول کا حق ادا کر دیا اور سنت رسول کو انتہائی درجہ تک زندہ کر دیا۔

شیخ الشیوخ نے شیخ عبد الواحد بن زید کی لکھی تعریف اپنی تصنیف میں تحریر کیا ہے:

قال القائمون بعقولھم علی فھم السنۃ والعاکفون علیھا علیھا بقلوبھم والمعتصمون بسیدھم من شر نفوسھم وھم الصوفیۃ۔

جو لوگ سنت رسول پر اپنی عقل کو صرف کرتے ہیں اور اپنے قلب سے متوجہ رہتے ہیں اور اپنے نفس کی خباثت سے اپنے سرور دوسرا کے دامن میں پناہ لیتے ہیں وہی صوفیا ہیں۔

شیخ الشیوخ اس تعریف کو نقل کرنے کے بعد فرماتے ہیں:—

ھذا وصف تام وصفھم بہ۔ یہ ان کی بہترین تعریف ہے جو کی گئی ہے۔

حضرت مخدوم جہاں شیخ شرف الدین احمد یحییٰ منیری نے شریعت و طریقت کی مطابقت اور وضاحت بڑے دلکش پیرائے میں کی ہے وہ اپنے مکتوب بست و پنجم میں تحریر کرتے ہیں کہ:—

---

[1] عوارف المعارف ص ۲۷ مصنف شیخ الشیوخ۔

طریقت راہے است کہ از شریعت خیزد و شریعت بیان توحید و طہارت و نماز و روزہ و حج و جہاد و زکوٰۃ و دیگر احکام شرع و معاملات است۔ اماں طریقت طلب کردن بحقیقت ایں معاملات است و تفحص کردن این مشروعات و آراستن اعمال بصفا ضمائر و تطہیر اخلاق است از کدورات طبعی چوں ریا و ہوا و جفا و شرک مانند ایں در جملہ ہر چہ بہ تہذیب و تطہیر ظاہر تعلق دارد شریعت است و ہر چہ بہ تصفیہ و تزکیۂ باطن تعلق دارد طریقت است۔ مثلاً جائے نماز را طاہر کردن از لوث نجاست شریعت است و دل پاک کردن از کدورات بشریت طریقت است پیش از نماز وضو کردن شریعت است و ہمیشہ باوضو بودن طریقت است، در نماز روئے قبلہ آوردن شریعت است و روے دل بحق آوردن طریقت است در جملہ ہر چہ در مرتبۂ حواس فرود آید رعایت آں کردن از شریعت است و ہر چہ درون پردہ قالب است رعایت

"طریقت وہ راہ ہے جو شریعت سے نکلتی ہے اور شریعت کا تعلق توحید، طہارت، نماز، روزہ، حج، زکوٰۃ، جہاد اور دیگر شرعی احکام اور معاملات سے ہے۔ لیکن طریقت ان معاملات کی حقیقت دریافت کرنے، ان مشروعات میں تفحص کرنے، اعمال کو صفائی ضمیر کے ساتھ آراستہ کرنے اور طبعی کدورتوں سے اخلاق کو پاک کرنے سے متعلق ہے۔ جب ریا، ہوا، جفا، شرک اور ان کی مانند دوسرے جملہ صفات کی تہذیب و تطہیر کا تعلق ظاہر سے ہو تو یہ شریعت ہے اور جو کچھ کہ باطن کے تصفیہ و تزکیہ سے تعلق رکھے، طریقت ہے مثلاً نماز پڑھنے کی جگہ کو نجاست کی آلودگی سے پاک کرنا شریعت ہے اور بشری کدورتوں سے دل کو پاک کرنا طریقت ہے۔ نماز کے پہلے وضو کرنا شریعت ہے اور ہمیشہ باوضو رہنا طریقت ہے۔ نماز میں قبلہ رو ہونا شریعت ہے اور اس میں دل کو حق کی طرف متوجہ رکھنا طریقت ہے جو اس کے اعتبار سے جو کچھ پیش آئے ان سبھوں کی رعایت کرنا شریعت ہے اور جو کچھ پردۂ قالب کے اندر ہے اس کی رعایت کرنا

کردن آں طریقت است و ہر چہ انبیاء علیہم السلام امت خود را آں فرمائند کہ خود کنند۔" ؎۱

طریقت ہے اور ہر چند کہ انبیاء علیہم السلام اس کا حکم فرماتے ہیں جو خود کرتے ہیں۔"

تصوف کی ان تمام تعریفات کے باوجود متقدمین کا ایک گروہ کہتا ہے کہ عہد رسالت میں کوئی شخص بھی صوفی کے لقب سے نوازا نہیں گیا ہے۔ یہ اصطلاح بغدادیوں کی رائج کی ہوئی متاخرین کی اختراع ہے۔ اس لیے اسلام میں اس کی کوئی وقعت اور حقیقت نہیں لیکن حضرت شیخ ابو نصر سراج (متوفی ۳۷۸ھ) نے اپنی تصنیف "کتاب اللمع" میں اس کا جواب دیا ہے اور معترضین کے اس اعتراض کا جواب ان الفاظ میں دیا ہے :-

"اصحاب رسول اللہ صلے اللہ علیہ وسلم کے لیے کوئی دوسرا تعظیمی لفظ مستعمل ہو ہی نہیں سکتا تھا اس لیے کہ ان کے جتنے بھی فضائل تھے سب سے اشرف و اعظم ان کی فضیلت ان کی صحابیت تھی اس لیے کہ صحبت رسول تمام بزرگیوں اور فضیلتوں سے بڑھ کر ہے۔ ان کا زہد، فقر، توکل، عبادات، صبر و رضا غرض کہ جو کچھ بھی ہے ان کے فضائل تھے۔ ان سب پر ان کا شرف صحابیت غالب تھا۔ پس جب کسی کو لفظ صحابی سے ملقب کر دیا گیا تو اس کے فضائل کی انتہا ہو گئی اور کوئی محل ہی باقی نہیں رہا کہ اسے صوفی یا کسی دوسرے تعظیمی لفظ سے یاد کیا جائے۔"

(کتاب اللمع مصنفہ شیخ سراج)

حضرت شیخ موصوف نے اس حقیقت کی بھی وضاحت کی ہے کہ بغدادیوں اور متاخرین کی اختراع غلط ہے، وہ لکھتے ہیں :-

---

؎۱ مکتوبات صدی مصنفہ حضرت مخدوم جہاں مکتوب بست و پنجم در ارکان شریعت و طریقت۔

لان فی وقت الحسن بصری رحمۃ اللہ علیہ کان یعرف ھذا الاسم وکان الحسن قد ادرک جماعۃ من اصحاب رسول صلعم [1]

"یہ لفظ (صوفی) حضرت حسن بصری رحمۃ اللہ علیہ کے زمانے میں رائج تھا۔ اور ان کا زمانہ صحابیوں سے معاصرت کا تھا۔"

مولانا عبدالماجد دریاآبادی اپنی تصنیف میں لکھتے ہیں کہ کتاب اخبار مکہ ہیں۔ جو روایت محمد بن اسحاق بن یسار وغیرہ سے ہے۔ اس سے تو یہ معلوم ہوتا ہے کہ یہ لفظ عہد اسلام سے پیشتر ہی معروف تھا اور عابد و برگزیدہ اشخاص کے لئے مستعمل تھا۔ [2]

لفظ صوفی کی حقیقت

تصوف اور صوفی کی حقیقت سمجھنے کے لئے اس کے لغوی اور اصطلاحی معنی پر غور کرنا ہوگا۔ جب ہم اس حقیقت کا جائزہ لیتے ہیں تو ہمیں یہ معلوم ہوتا ہے کہ لفظ صوفی کی اصطلاح پر مختلف لوگوں کے مختلف خیال ہیں۔

صاحب کتاب اللمع نے لفظ تصوف پر بھی روشنی ڈالی ہے۔ وہ لکھتے ہیں کہ :۔

"لفظ تصوف اور صوفی کی وجہ تسمیہ کیا ہے؟ اس کے جواب میں مؤلف نے مختلف قول نقل کر دیئے ہیں۔ ایک قول یہ ہے کہ صوفی دراصل صفوی تھا، یہ لفظ ذرا ثقیل تھا۔ کثرت استعمال سے زبانوں پر صوفی رہ گیا۔

حضرت ابوالحسن قنادؒ کا خیال تھا کہ صوفی لفظ صفا سے مشتق ہے اور اس کا اطلاق اہل صفا پر ہوتا ہے۔ ایک

---

[1] کتاب اللمع مصنفہ شیخ سراج ص۲۲

[2] تصوف اسلام مصنفہ عبدالماجد دریاآبادی ص۳۵

اور بزرگ کا مقولہ ہے کہ جو لوگ کدورت بشریت سے پاک و صاف کر دئیے گئے وہ صوفی کہلانے لگے۔ ایک اور بزرگ کی رائے میں ان لوگوں کا لباس انبیاء علیہم السلام کی تقلید میں صوف (پشمینہ) ہوتا ہے، اس لئے یہ صوفی کہلائے۔ ایک اور گروہ اس طرف گیا ہے کہ اصحاب صفہ کے باقیات صالحات صوفی کے لقب سے موسوم ہوئے وقس علیٰ ھٰذا۔" [1]

حضرت شیخ علی ہجویریؒ نے کشف المحجوب میں اس کی مزید وضاحت کی ہے اور بڑے دل کش پیرائے میں اس کے اشتقاق سے بحث کی ہے۔ ملاحظہ ہو:۔

"مردماں اندر تحقیق ایں اسم بسیار سخن گفتہ اند و کتب ساختہ و گروہے ازاں گفتہ اند کہ صوفی را برائے آں صوفی خوانده اند کہ جامۂ صوف دارد و گروہے گفتہ اند کہ صوفی را از برائے آں صوفی خوانند کہ از صف اول باشد و گروہے گفتہ اند کہ بداں صوفی گویند کہ تولا بہ اصحاب صفہ رضی اللہ عنہم کردہ اند دگروہے گفتہ اند کہ ایں اسم از صفا مشتق است و ہر کسے را اندر معنی تحقیق ایں طریقت لطائف بسیار است۔"

اس نام کی تحقیق میں لوگوں کے مختلف خیالات ہیں اور بہت سے قول ہیں۔ ایک گروہ کے نزدیک چونکہ یہ لوگ جامۂ صوف میں ملبوس رہتے تھے اس لئے صوفی کہلائے بعض کا خیال ہے کہ لفظ صوفی کا ماخذ صف اول ہے یہ حضرات چونکہ صف اول میں رہتے تھے اس لئے لفظ صوفی سے موسوم ہوئے ایک گروہ کا مسلک ہے کہ چونکہ ان لوگوں کو اصحاب صفہ سے خاص محبت تھی اس لئے صوفی کہلائے ایک اور جماعت اس لفظ کا اشتقاق لفظ صفا سے مانتی ہے اور ہر گروہ اپنی تائید میں خوب خوب نکتہ

---

[1] تصوف اسلام صـ ۳۶

بحوالہ کشف المحجوب صـ ۲۲

پیدا کرتا رہتا ہے۔"

شیخ کے نزدیک صوفی وہ ہے جس کا لقب صفا (صفائی) سے لبریز ہو اور کدر (گندگی) سے خالی ہو اور اس مرتبہ تک کاملانِ ولایت ہی پہنچ سکتے ہیں۔

" صفا ضد کدر بود و کدر صفت بشر بود، وجہ حقیقت صوفی بود آنکہ اوازکدر گزر بود۔ "

ترجمہ : صفا (صفا) کدر (گندگی) کی ضد ہے اور کدر انسان کی صفت ہے، اس کے صوفی کہلانے کی وجہ یہ ہے کہ وہ کدر (گندگی) سے دور ہوتا ہے۔

دوسری جگہ تحریر ہے کہ :۔

" صوفی نامے است کہ مر کاملان ولایت را محققان بدیں نامے خوانده اند۔" [1]

"صوفی ایک ایسا نام ہے جس سے کاملانِ ولایت کو محققین نے موسوم کیا ہے۔"

چنانچہ دورِ اول کے مشائخ طریقت میں سے کسی بزرگ کا قول ہے کہ :۔

من صفاہ الحب فھو صاف ومن صفاہ الحبیب فھو صوفی۔ [2]

"جس کسی کو محبت صاف کر دے وہ صافی ہے اور جسے محبوب اپنے لئے صاف کرے وہ صوفی ہے۔"

حضرت مخدوم جہاں شیخ شرف الدین یحییٰ منیری رحؒ نے شرح آداب المریدین میں تصوف پر اس طرح روشنی ڈالی ہے :۔

" التصوف ماخوذٌ من الصفا والصفاء محمودٌ فی کل لسانٍ "

"تصوف ماخوذ ہے صفا سے، اور صفا پسندیدہ ہے ہر زبان میں،

---

[1] کشف المحجوب ص ۲۵ ، [2] ایضاً

صفا ستودہ شدہ است در ہمہ
زبانہا و ضدہ الکدورۃ
وضد صفا کدورت است و آں
مذموم است در ہمہ زبانہا در
خبر است از پیغامبر علیہ السلام فرمود
کہ ذھب الصفاء من الدنیا
وبقیت الکدورۃ فالموت
تحفۃٌ للمسلم گفت صفا از
دنیا برفت و باقی ماند کدورت
پس مرگ امروز تحفہ بود مر ہر مسلمانی
را پس ایں نام از صفا خاست و
غالب شدہ است مر ایں طائفہ
را تا گویند رجل صوفی و مر جماعت
ایشاں را صوفیہ گویند و مر کسی را کہ خود
را بدیشاں پیوندد اند متصوف
خوانند و مر جماعت ایشاں را
متصوفہ گویند و نیز میگویند کہ ایں
نام را شاہد نیست از روئے عربیت
نہ قیاسی نہ اشتقاقی و اظہر ان است
کہ ایں لفظ بر طریق لقب است از
بہر صفا کہ در ایشاں است۔

اور صفا کی ضد کدورت ہے،
اور یہ تمام زبانوں میں
مذموم ہے۔ حضرت پیغمبر
علیہ السلام سے حدیث شریف
سے وارد ہے کہ آنحضور صلی اللہ
علیہ وسلم نے فرمایا کہ صفا
دنیا سے ختم ہو گئی اور کدورت
رہ گئی پس موت مسلم کا تحفہ ہے اور
یہ نام صفا کے لیے مخصوص ہے اور
خاص کر اس جماعت کو مرد صوفی
کہا جاتا ہے۔ اور ہر اس شخص کو
جو اس میں اپنے کو شامل کرتے ہیں
متصوف کہے جاتے ہیں اور اس
جماعت کو متصوفہ کہا جاتا ہے
اور یہ بھی کہا جاتا ہے کہ
یہ نام ثابت نہیں ہے
نہ لغت عربی کی رو سے
نہ قیاسی ہے اور نہ اشتقاقی اور
ظاہر ہے کہ یہ لفظ لقب کے
طور پر مستعمل ہے یہ اس لیے بھی کہ جو صفائی
(متصوف) ان کے اندر ہے۔

لہ شرح آداب المریدین مصنفہ مخدوم جہاں شرف الدین یحییٰ منیری ص ۹۳ (مخطوطہ)

حضرت مخدوم جہاں اپنے مکتوب میں تصوف پر اس طرح روشنی ڈالتے ہیں،۔

"بداں کہ راہِ تصوف دیرینہ است واعمال انبیاء و صدیقاں بودہ است بحکم غلبہ عادات زشت در زمانہ پدید آمدہ است صورت حال صوفیاں در چشم مردماں زشت می نماید۔" [۱]

معلوم ہو کہ راہ تصوف قدیم ہے اور انبیاء اور صدیقین کے اعمال بھی یہی ہیں چوں کہ (اب) برائی کا غلبہ ہے اس لئے صوفیوں کا حال بھی لوگوں کی نگاہ میں بُرا دکھائی دیتا ہے۔"

(حالانکہ یہ راہ محبت کی راہ ہے)

حضرت محمد عربی صلی اللہ علیہ وسلم صوفیٔ اعظم تھے۔ قرآن کریم میں جتنی تعلیمات ہیں، آپ نے سب پر عمل کر دکھایا اور آپ خلق عظیم کے مقام پر کھڑے ہوئے۔ آپ میں باطنی اور خارجی پاکیزگیوں کی ہر قسم پائی گئی۔ قرآن کریم مجمع البحرین ہے اور محمد عربی صلی اللہ علیہ وسلم مجمع البحرین ہیں۔ قرآن کریم میں روحانی اور مادی برکتوں کے سمندر موجیں مارتے ہیں اور نبی کریم صلے اللہ علیہ وسلم کے ذات وصفات میں بھی۔ غرض خالص اسلامی صوفیت اسلام سے علیحدہ کوئی چیز نہیں۔ اسلامی شریعت اپنے اندر طریقت کو بھی سموئے ہوئے ہے۔ دراصل شریعت اور طریقت کے ایک ہی معنیٰ ہیں "راستہ"۔ اسلام بہترین راستے کی طرف قرآن مجید کے ذریعہ رہنمائی کرتا ہے۔ اسلامی نقطہ نظر سے شریعت اور طریقت میں کوئی ضد نہیں۔ بعد میں لوگوں نے اختلاف پیدا کئے۔ اسلام کی تعلیم ہمہ جہتی اور کلی ہے۔ وہ اجزا پر زور نہیں دیتا بلکہ تکمیل پر زور دیتا ہے۔ اسلامی اصول میں تزکیۂ روح بھی ضروری ہے اور تعلیم کتاب بھی لازمی ہے۔ اسلامی تعلیم کو مکمل کئے بغیر تزکیہ روح ناممکن ہے۔ مثلاً نماز، روزہ زکوٰۃ حج وغیرہ قرآن حکیم کی چھوٹی سے چھوٹی تعلیم بھی کمال اہمیت رکھتی ہے

---

[۱] مکتوبات صدی مصنفہ حضرت مخدوم جہاں مکتوب بست و پنجم در ارکان شریعت و طریقت

شریعت قرآن کو کسی حالت میں بھی نظر انداز نہیں کیا جا سکتا۔[1]

طبقات اہلِ تصوف

چونکہ عوام اور خواص میں اہلِ تصوف کی عزت و عظمت بہت ہوتی ہے اور ان کی قدر دانی دل سے کی جاتی ہے ان کے آستانوں پر جبینِ عقیدت جھکائی جاتی، ان کی تعلیمات زندگی کے لئے مشعل راہ اور لائحہ عمل تسلیم کئے جاتے اس لئے اہلِ دنیا نے بھی ان کی نقالی شروع کی اور حصولِ دنیا ان کا مقصود رہا۔ اس لئے علمائے تصوف نے اس کی بھی وضاحت کردی تاکہ ان کے مکر و فریب سے محفوظ رہا جا سکے۔

شیخ علی ہجویریؒ نے اہلِ تصوف کے تین طبقے یا درجے بتائے ہیں۔ ۱۔ صوفی، ۲۔ متصوف، ۳۔ مستصوف۔ حضرت شیخؒ کے الفاظ میں اس کی وضاحت سُنیے:

"صوفی آں بود کہ از خود فانی بود و حق باقی و از قبضۂ طبائع رستہ بحق پیوستہ۔ متصوف بمجاہدہ ایں درجہ را ہمی طلبد و اندر طلب خود را بر معاملاتِ ایشاں درست ہمی کند و مستصوف آنکہ برائے برائے مال و منال و جاہ و دنیا خود را مانند ایشاں کردہ و از ہر دو چیز، ہیچ خبرے ندارد تاحدے کہ گفتہ اند المستصوف عند الصوفیاء کالذباب وعند غیرھم کالذباب مستصوف

صوفی وہ ہے جو اپنے نفس سے فانی ہو کر حق میں زندہ و باقی ہو اور رمادیت سے گذر کر حقیقت تک رسائی حاصل کر چکا ہو اور متصوف وہ ہے جو مجاہدہ کر کے یہ راہ طے کر رہا ہو اور اس منزل تک رسائی کی کوشش میں ہو اور مستصوف وہ ہے جو محض جاہ و منال کے لئے دنیا طلبی کی خاطر اپنے کو صوفی اور متصوف کے مشابہ بنا دے اور حقیقتاً ان دونوں سے بہرہ مند نہ ہو۔ کسی نے خوب کہا ہے کہ

---

[1] اردو میں صوفیانہ شاعری صہ ۲۳

بہ نزدیک صوفی از حقیرے چوں	مستصوف صوفی کی نظر میں مکھی
مگس بود آنچہ کند نزدیک ولی	کی طرح حقیر ہوتا ہے اور
ہوس بود و نزدیک دیگراں چوں	دوسرے کی نظر میں بھیڑیئے
گرگ بے اختیار بود کہ ہمتش لحمت	کی مانند جس کی غذا ہی گوشت
مردار بود۔" [1]	اور خون ہے۔"

اس دنیا میں کبھی نہ کبھی ہر انسان پر ایسا وقت ضرور آتا ہے جب اسے سکون کی تلاش اور اللہ والوں کی جستجو ہوتی ہے جس سے اس کی بے چینی اور ذہنی انتشار دُور ہو، اسے سکون کا سامان اور درد کا درمان ملے لیکن اس دور میں صوفی نظر نہیں آتے اور متصوف کہیں کہیں بڑی تلاش و جستجو کے بعد مل جاتے ہیں اور مستصوف صوفی کے لباس میں ہر جگہ نظر آتے ہیں عوام انہیں صوفی سمجھتی ہے، ان کے آستانے پر جبینِ عقیدت خم کرتی ہے اور آخر میں ان کے ریا اور مکر و فریب سے دھوکا کھا کر صوفی سے بدگمان ہوتے ہیں۔ حالانکہ جس کے آستانے تک ان کی رسائی ہوئی ہے وہ صوفی نہیں ہیں نہ وہ شریعت کے شناسا نہ طریقت کے عامل نہ حقیقت سے واقف، اس لئے اس سے ایسی ایسی باتیں ظاہر ہوتی ہیں جو شریعت و طریقت کے منافی ہیں لیکن یہ بدقسمتی ہے کہ جاہل ضعیف العقیدہ اور اوہام پرست حضرات ان کے جال میں پھنس جاتے ہیں اور پھر بدگمان ہو کر تصوف کو زندقہ اور بدعت کے زمرے میں شمار کرتے ہیں۔ حالانکہ تصوف کی تعریف اور اس کی تاریخ اور اس کے لائحہ عمل سے یہ حقیقت آشکارا ہوتی ہے کہ ہر دور میں اہلِ تصوف نے ایثار و قربانی کا ثبوت دیا اور اخلاص و محبت کا درس دیا اور یہی تصوف کی حقیقت ہے۔

یہ بھی حقیقت ہے کہ اپنے اپنے ذوق و بصیرت کے اعتبار سے

---

[1] کشف المحجوب: مصنفہ شیخ علی ہجویری ص ۲۵

صوفیت کی مختلف تعریفیں کی گئی ہیں لیکن تعریفیں مسلک کے اعتبار سے بھی ہوئی ہیں اور کیفیتِ وجدان کے اعتبار سے۔ فی الحال مجھے صوفیت کو مدنظر رکھنا ہے۔ مسلم تہذیب میں بھی صوفیت کے مختلف خانوادے اور سلاسل اُبھرے اور ان میں اختلاف بھی رہے۔ پھر بعض عناصر مسلم صوفیت میں ایسے بھی داخل ہوئے ہیں جنھیں ہم غیر اسلامی کہیں گے یہ عناصر خصوصاً یونان اور ہندوستان سے آئے لہٰذا اختلافات پیدا ہوئے۔

مسلمان صوفیوں نے تبلیغ دین کا کام کیا شریعت کو مستحکم بنایا اور اسلام کی لطافتوں کو پیش کیا۔ ان کے سلسلے غلط قسم کی باتوں کو ہرگز پیش نہیں کرتے تھے اگر ہم ان صوفیوں کی تصانیف کا مطالعہ کریں تو صاف طور پر پتہ چلتا ہے کہ انہوں نے شریعت کا اتباع کیا اور اس کی پیروی کی ہے۔ ان کی مراد طریقت سے صرف یہ تھی کہ وہ اپنے اپنے طور پر ضرورت اور حالات کے لحاظ سے تربیت اخلاق اور تزکیۂ روح کے مناسب نفسیاتی طریقے مقرر کرتے رہتے تھے۔ عبادت و ریاضت اور اوراد و وظائف کی تعلیم اسی غرض سے دی جاتی تھی۔ ان کا طریقۂ تربیت دائرۂ اسلام کے اندر رہ کر ہوتا تھا۔ صوفیائے کرام اسلام کے بہت بڑے ستون تھے۔ ان بزرگوں نے تربیت روح کے لئے مختلف منازل اور مقامات متعین کیے ہیں ان کو کبھی مقام کبھی عالم کہتے ہیں۔ روح انسانی تربیت پاکر مشاہدۂ جمال الٰہی کرتی ہے اور چونکہ خدا کی ذات و صفات بیکراں ہے اس لیے وہ مختلف مقامات سے گذرتی ہے۔ صوفیوں نے ان مقامات کے اصطلاحی نام رکھے ہیں جیسے عالمِ حیرت، عالمِ سکر، عالمِ صحو، عالمِ جذب، عالمِ فنا، عالمِ بقا وغیرہ مرکب اصطلاحیں بھی پائی جاتی ہیں جیسے فنا فی اللہ، فنا فی الرسول، فنا فی الشیخ اور بقا باللہ وغیرہ۔ یہ ساری اصطلاحیں تمثیلی اور رمزی ہیں ان میں استعارہ کا رنگ پایا جاتا ہے۔ یاد رہے کہ بعض دفعہ لوگوں نے صوفیوں کی تصریحات کو اپنے اپنے ذوق کے مطابق سمجھ لیا ہے یہ بھی ممکن ہے کہ خود صوفیوں سے

اس جہت میں غلطی ہوئی ہو کہ وہ عوام الناس کے ذہن کی گمراہی کے امکانات کو صحیح طور پر نہ سمجھ سکے بہت سے ایسے مسائل ہیں جن کو اسلامی شریعت کی روشنی میں سمجھنے کی کوشش کرنی چاہیئے ورنہ بڑے بڑے خطرات پیدا ہو جائیں گے خصوصاً وحدت الوجود اور وحدت الشہود کے مسائل، ہمہ اوست اور ہمہ از دست کا نازک فرق، عالم جذب و مستی میں ایک صوفی ہمہ اوست کا نعرہ لگا دیتا ہے اور یہ جذب کی کیفیت ہے۔ لیکن ایک سالک صوفی وحدہٗ لاشریک کا اس اعتبار سے قائل ہوتا ہے کہ کوئی چیز خدائے تعالیٰ کے مثل نہیں بن سکتی اس کا جزو بھی قرار نہیں دی جاسکتی، ساری کائنات اس کی مخلوق ہے اور وہ خالق کیوں کہ ہر چیز خدا کے مقابلے میں ہیچ ہے۔ اس لیے عالم میں خدا کی ذات ہی ہے اور کچھ نہیں۔ اور ہر شئے پر اس کی قدرت کامل ہے اور ہر چیز میں اس کی صفتوں کی جلوہ گری ہے۔ اس طرح اضافی طور سے ہمہ اوست کہا جاسکتا ہے۔ لیکن بعض صوفیوں نے احتیاط کی ہے اور اسلامی نقطۂ نظر پیش کرتے ہوئے ہمہ از وست کا عقیدہ پیش کیا ہے اگر ہم وحدۃ الوجود کے متعلق یہ کہیں کہ ہر چیز خدا ہے تو گمراہ کن خیال ہے لیکن اس کے معنی لے لیں کہ اللہ تعالیٰ کا وجود وحدانی ہے تو یہ صحیح ہے۔ دوسرے چھوٹے چھوٹے وجود خدائے تعالیٰ کی مخلوق ہیں اور چونکہ خالق کے مقابلے میں ہیچ ہیں اس لیے اضافی طور پر کہا جاسکتا ہے کہ اصل وجود خدائے تعالیٰ ہی کا ہے اور عالم میں اس کے سوا کچھ نہیں۔ بعض صوفیوں نے اس خطرے سے بچنے کے لئے محتاط طور پر یہ کہا کہ اس کائنات کے ذرّہ ذرہ میں صرف خدائے تعالیٰ کی عظمت کا مشاہدہ ہوتا ہے اور اس کی ذات جلوہ کناں ہے۔ ہر شئی میں ہم اس کی کبریائی کا مشاہدہ کرتے ہیں۔

اسلام کی چودہ سو سال کی تاریخ میں مختلف نشیب و فراز پیدا ہوئے اور مسلمانوں کے صوفیانہ خیالات میں دوسرے ادیان کے خیالات کی ملاوٹ بھی ہوئی۔

کہیں تو افلاطونی خیالات داخل ہوئے تو کہیں ایرانی خیالات، کہیں عیسائیت نے نقصان پہنچایا تو کہیں یہودیت نے، اور سب سے بڑھ کر ہند و تہذیب کے اُلجھے ہوئے ویدانتی فلسفے نے۔ ان سارے بیرونی افکار و خیالات نے بعض کمزور ذہن اور ناتواں قلب رکھنے والے صوفیوں کو متاثر کیا۔ یہاں تک کہ اسلامی صوفیت میں امراض پیدا ہو گئے۔ کہیں رہبانیت نے جنم لیا اور کہیں ملحدانہ خیالات نے سر اُٹھایا اور اسلامی صوفیت اپنی پاک اور منزہ حالت پر قائم نہ رہ سکی۔ لیکن اس کے باوجود ہر دور میں صحیح اسلامی ذہنیت رکھنے والے صوفی بھی بڑے جمال و جلال سے نمودار ہوئے اور انہوں نے غیر اسلامی تبانِ افکار کو توڑا اور اللہ تعالےٰ نے ان خطرناک اثرات کو دور کرنے کے لیے بکثرت ایسے صوفیوں کو مامور کیا جنھوں نے وحدانیت کا مصفا اور منزہ چہرہ دکھلایا۔

صوفیوں کی خدمات

صوفی جو تصوف کی راہ پر چلنے والے ہیں ان کا خدا ہر جگہ حاضر و ناظر ہے۔ کسی جماعت یا فرقہ میں محدود نہیں۔ چونکہ تصوف کی تعلیم صلح و آشتی کی ہے اور اس کی خمیر میں یہی جذبہ کارفرما ہے، اس لئے صوفی کے نزدیک کفر و اسلام اور دیر و حرم میں کوئی زیادہ تفریق نہیں۔ عشق و محبت ان کی اصل پونجی ہے۔ صوفی ان چیزوں کو ایک ہی نظر سے دیکھتا ہے اس لئے وہ تعصب اور تنگ نظری سے پرے رہ کر کسی فرقہ کو قابلِ مذمت نہیں سمجھتا اور نہ کسی عقیدہ کو شرک و بدعت تصور کرتا ہے وہ ان تمام خیالات و احساسات سے آزاد رہنا چاہتا ہے۔ چنانچہ بابائے اردو ڈاکٹر عبدالحق نے اپنی تصنیف "اردو کی نشو و نما میں صوفیائے کرام کا حصہ" صوفی اور مولوی کا تقابلی جائزہ بڑے دل کش پیرائے میں لیا ہے۔ وہ تحریر فرماتے ہیں:-

> "صوفی صوف سے مشتق ہو یا صفا سے وہ مذہبی اور اخلاقی عالم میں ایک خاص حیثیت رکھتا ہے وہ ملک و ملت سے بے نیاز ہے

اور ہر قوم و ہر مذہب میں پایا جاتا ہے وہ ایک قسم کا باغی ہے جو رسم اور ظاہر داری کو، جو دلوں کو مردہ کر دیتی ہے، روا نہیں رکھتا اور اس کے خلاف علم بغاوت بلند کرتا ہے۔ مولوی اور صوفی میں یہ فرق ہے کہ وہ ظاہر کو دیکھتا ہے اور یہ باطن کو، وہ لفظ کو دیکھتا ہے اور یہ معنی کو، وہ رسمیات اور تقلید کا پابند ہے اور یہ ان سے بیزار، اس کی نظر برائی پر پڑتی ہے اور یہ برے سے برے میں بھی بھلائی کا پہلو ڈھونڈھ نکالتا ہے وہ لعن و طعن سے کام لیتا ہے اور یہ مہر و محبت سے، وہ سختی اور تشدد کرتا ہے اور یہ نرمی اور ملائمت، وہ بہت کم معاف کرتا ہے اور اس کا شیوہ درگزر کرنا، وہ خود اور خودنمائی سے بڑا بنتا ہے اور یہ فروتنی اور خاکساری سے دلوں میں گھر کرتا ہے وہ دوسروں کے عیوب کا متجسس رہتا ہے اور یہ اپنے نفس کا محاسبہ کرتا ہے۔ وہ اپنے علم سے مرعوب کرنا چاہتا ہے اور یہ اپنے عمل سے دوسروں کو لبھاتا ہے۔

مولوی سب کو ایک لاٹھی سے ہانکتا ہے لیکن صوفی ہر ایک کے رنگ طبیعت کو دیکھتا ہے اور جیسی جس کی طبیعت کی افتاد ہوتی ہے اسی ڈھنگ سے اس کو دیکھتا ہے اور اس کی تربیت کرتا ہے اس میں بعض اوقات وہ شریعت سے تجاوز کرنے یا بعض ارکانِ اصول کے ترک کرنے میں بھی مضائقہ نہیں کرتا۔ اس کی نظر انجام پر رہتی ہے۔ وہ مولوی کی طرح لفظ کا بندہ نہیں بلکہ معنی کو دیکھتا ہے۔ اصل صوفی بہت بڑا ماہر نفسیات ہوتا ہے اور باوجودیکہ دنیا سے ایک گونہ بے تعلق اور مولوی اس کے مقابلے میں بہت زیادہ دنیا دار ہوتا ہے مگر وہ علماء کی نسبت کہیں زیادہ زمانے کی

نبض کو پہچانتا وہ دلوں کو ٹٹولتا اور اسی پر بس نہیں کرتا بلکہ دلوں
کی تہ تک پہنچتا ہے جہاں انسان کے اصل اسرار چھپے اور دبے رہتے
ہیں جن سے ہم خود بھی اکثر واقف نہیں ہوتے۔ مولوی کی نظر وہاں
تک نہیں پہنچتی ہے اس میں صوفی کی جیت ہے اس کے بعد وہ نفس
کی چوریاں اس آسانی، خوش اسلوبی اور لطف سے پکڑتا ہے
اور ان کی اصلاح کرتا ہے کہ بعض اوقات مرید کو خبر نہیں ہونے پاتی
اس کا سب سے بڑا اور مقدم اصول دلوں کا ہاتھ میں لینا،
اس مقصد کے حصول میں وہ کسی ظاہری رکاوٹ کی خواہ وہ شرعی
ہو یا غیر شرعی پرواہ نہیں کرتا اور سب کو توڑ کر رکھ دیتا ہے اور
صحیح بھی ہے جب دل ہاتھ میں آگیا تو گویا سب کچھ مل گیا۔ کسی
دل کا ہاتھ میں لانا ایک نئی دنیا کے فتح کرنے سے کم نہیں۔ یہ جو
مشہور ہے کہ " دل بدست آر کہ حج اکبر ست " یہ صوفی ہی کا
قول ہے اور صوفی ہی اس پر عمل کر سکتا ہے۔ حضرت رابعہ بصریؒ
کی نسبت کہا جاتا ہے کہ انہوں نے ایک بار فرمایا:

"اگر در ہوا پری مگسے، اگر بر دریا روی خسے،
اگر دل بدست آری کسے۔" [1]

یہی وجہ ہے کہ علماء و اُمراء بلکہ حکومتوں اور بادشاہوں سے بھی وہ
کام نہیں ہو سکتا جو فقیر اور درویش کر گزرتے ہیں۔ بادشاہ کا دربار خاص ہوتا
ہے اور فقیر کا دربار عام ہے جہاں بڑے چھوٹے امیر غریب، عالم جاہل کا کوئی
امتیاز نہیں ہوتا۔ بادشاہ جان و مال کا مالک ہے، لیکن فقیر کا دلوں پر قبضہ
ہوتا ہے اس لئے اُن کا اثر محدود ہوتا ہے اور ان کا بے پایاں، اور یہی سبب ہے کہ

---

[1] اُردو کی ابتدائی نشو و نما میں صوفیائے کرام کا حصہ: مصنف ڈاکٹر عبدالحق صفحہ ۲۰

درویش کو وہ قوت اور اقتدار حاصل ہو جاتا تھا کہ بڑے بڑے جبار اور باجبروت بادشاہوں کو بھی اس کے سامنے سر جھکانا پڑتا ہے۔

ہندوستان میں مسلمان درویش، پُرخطر اور دشوار گذار راستوں، سربفلک پہاڑوں اور لق و دق بیابانوں کو طے کر کے ایسے مقامات پر پہنچے جہاں اسلام اور مسلمان کے نام تک سے بھی کوئی واقف نہ تھا اور جہاں ہر چیز اجنبی اور ہر بات ان کی طبیعت کے مخالف تھی۔ جہاں کی آب وہوا، رسم و رواج، صورت و شکل آداب و اطوار، لباس، بات چیت، غرض ہر چیز ایسی تھی کہ ان کو اہل ملک سے اور اہلِ ملک کو ان سے وحشت ہو۔ لیکن حال یہ ہے کہ انہیں مرے صدیاں گذر چکی ہیں لیکن اب بھی ہزاروں لاکھوں بندگان خدا صبح و شام ان کے آستانے پر پیشانیاں رگڑتے ہیں اور جن جن مقامات پر ان کے قدم پڑے تھے وہ اب تک شریف اور مقدس کے نام سے یاد کیے جاتے ہیں۔ یہ کیا بات تھی۔؟ بات یہ تھی کہ ان کے پاس دلوں کے کھینچنے کا وہ سامان تھا جو نہ اُمراء و سلاطین کے پاس ہے اور نہ علماء و حکماء کے پاس۔

میرے خیال میں بلادِ عرب کے ماسوا دنیا کے تمام ممالک میں صوفیائے کرام کا یہ گروہ سرگرم عمل رہا۔ خصوصیت کے ساتھ بغداد، شام، عراق، روسی ترکستان، ایران و افغانستان کے خطے میں یہ گروہ اپنا مشن لے کر اخلاق و محبت کا درس دیتا رہا۔ ان کے قدم چوتھی صدی ہجری میں ہندوستان کی طرف بھی بڑھے۔ پہلے سندھ اس کے بعد پنجاب پھر راجستھان، بہار، بنگال، دہلی، یوپی، کشمیر، دکن، گجرات اور جنوبی ہند کے بیشتر حصوں کو اپنے رشد و ہدایت کا مرکز بنایا بالخصوص پانچویں صدی ہجری سے ہندوستان میں بزرگان دین کی آمد کا سلسلہ ملتا ہے۔ ان کی مقبولیت اور شہرت اس قدر ہوئی کہ ان کی خانقاہوں سے رشد و ہدایت کی کرن پھوٹنے لگی اور یہ روشنی آہستہ آہستہ پھیلتی گئی اور زیادہ تابناک ہوتی گئی۔ پہلے تو راجاؤں اور ان کے امراء نے شدت کے

ساتھ مخالفت کی لیکن جب عوام کی عقیدت میں پختگی اور صوفیوں کے طرزِ عمل میں اخلاص و محبت دیکھی تو پھر انہوں نے بھی جبینِ عقیدت اسی آستانے پر جھکائی صوفیائے کرام کا یہ گروہ ہندوستان کے مختلف خطوں میں پیغام صلح و آشتی اور محبت و خلوص کی تعلیم لے کر پہنچا۔ پنجاب میں حضرت داتا گنج بخش علی ہجویریؒ، راجستھان میں حضرت خواجہ معین الدین چشتیؒ، ملتان میں حضرت بہاء الدین زکریا ملتانیؒ، دہلی میں حضرت بدر الدین سمرقندیؒ اور حضرت بختیار کاکیؒ، آسام میں حضرت جلال الدین تبریزیؒ، بنگال میں حضرت خواجہ احمد دمشقیؒ اور بہار میں امام تاج فقیہہ حضرت شہاب الدین پیر جگ جوتؒ جیسے بزرگوں سے رشد و ہدایت کا سلسلہ جاری و ساری ہوا۔

یہ بات قابل غور ہے کہ بزرگان دین نے تبلیغ اسلام اور تعلیمات دینی کی اشاعت مختلف سلاسل کے ذریعہ کی۔ تصوف میں سلسلے کی اہمیت اس لیے بھی ہے کہ اسی کے ذریعہ تعلیم شریعت و طریقت کا انداز فکر اسی کے ذریعہ ہوا اور اسی نے شہرت اور عظمت حاصل کی اگرچہ سلسلہ چشتیہ، سہروردیہ، فردوسیہ، قادریہ، زاہدیہ، قلندریہ، نقشبندیہ اور شطاریہ سلاسل کی ترویج ہندوستان گیر طور پر ہوئی اور اسی مکتبِ فکر نے ذہنی اور روحانی طور پر ایک انقلاب لایا، اس لیے مناسب یہ ہے کہ اس پر تفصیلی روشنی ڈالی جائے تاکہ یہ حقیقت آشکارا ہو جائے کہ بزرگان دین نے کس طرح ملک گیر پیمانے پر اپنے مشن کو آگے بڑھایا ہے اور صلح و آشتی کا پیغام ایک دنیا کو دیا جس نے اخلاص و محبت کی ترویج و اشاعت کی۔

صوفیائے کرام اور ان کے سلاسل

یہ مسلمہ حقیقت ہے کہ صوفیائے کرام ہی کی وہ مقدس ہستی ہے جنھوں نے تبلیغِ اسلام انسانیت اور عوام کی بے لوث اور بے غرض خدمت کی ہے۔ یہی وہ ذات اقدس ہے جس نے اخوت اور خدمتِ خلق کے لئے دور دراز ملکوں کی مسافتیں طے کر کے اور دشوار گزار راستوں کی صعوبتوں کو جھیل کر دنیا کے مختلف خطوں کو اپنی تبلیغ رشد و ہدایت کا مرکز بنایا۔ ان کے آستانے بلا فرق مذہب و ملت سبھوں کے لئے سکون کے سامان اور درد کے درماں بنے۔ عوام الناس جوق در جوق ان کے حلقہ بگوش ہوئے اور جبینِ عقیدت ان کے آستانے پر جھکائی۔ ان کی انسان دوستی، شرافت نفسی، ایثار و قربانی اور خلوص و محبت نے مخالفین کو بھی دوست بنایا۔ ان کے اخلاق کریمانہ، اور عجز و انکسار نے نہ صرف ان کا گرویدہ بنایا بلکہ عوام ان کے دامن سے وابستہ ہو کر ان کے حلقۂ ارادت میں داخل ہو گئے۔ وہ مذہبی پیشوا اور رہنما بن گئے۔ ان کی زبان فیض ترجمان سے جو کلمات صادر ہوئے وہ زندگی کے لئے لائحہ عمل اور مشعل راہ بنے۔ صوفیائے کرام کی یہ جماعتیں مدینہ منورہ، مکہ معظمہ، طائف، شام، بغداد، بصرہ، عراق، دمشق، ماوراء النہر، بسطام، خرقان، سمرقند، بخارا، مشہد، مرو، روسی ترکستان، خراسان، فارس، آذربائیجان، کرمان، طبرستان، رملہ، طوس غزنی، اصفہان، جام، کاشغر، تبریز، ایران، تہران، نیشاپور، سہرورد، چشت خوارزم، افغانستان، کابل، ہرات ہوتی ہوئی خطہ ہند میں بھی عہد بہ عہد اپنا مشن لے کر کہیں خلوت نشیں اور کہیں جلوت نشیں ہوتی رہیں۔

ہندوستان میں ان صوفیائے کرام کی آمد پانچویں صدی ہجری سے متواتر

طور پر نظر آتی ہے۔ کچھ ایسے قرائن بھی ہیں جن سے اندازہ ہوتا ہے کہ ہندوستان میں عہد صحابہ اور تابعین ہی سے مسلمانوں کی آمد شروع ہوگئی تھی۔

ہندوستان ہر دور میں روحانی تعلیمات کا مرکز رہا ہے۔ ہندو، بدھ، جین مذاہب کے پیشواؤں نے اسی خطہ کو اپنی روحانی تعلیمات کا مرکز بنایا۔ اسی طرح مسلمانوں نے بھی اسی خطہ کو رشد و ہدایت کے لیے منتخب کیا۔ چنانچہ ہندوستان کے مختلف صوبے مثلاً راجستھان، دہلی، پنجاب، بہار، گجرات، دکن (آندھرا پردیش) یوپی، بنگال، کشمیر، جنوبی ہند و شمالی ہند کے اکثر مقامات روحانی تعلیمات اور رشد و ہدایت کے مراکز بنے۔ جہاں سے صوفیائے کرام کے مختلف سلاسل کی تعلیمات اور رشد و ہدایت جاری و ساری ہوئے۔ ان صوفیائے کرام کی شاخیں اور سلسلے مختلف انداز اور مختلف روپ میں پھیلتے رہے۔ اور یہ تمام شاخیں اصطلاحی طور پر سلاسل کے نام سے موسوم ہیں۔ اس کی حیثیت اس باغ کی طرح ہے جس میں رنگ برنگ کے پھول کھلے ہیں اور جس طرح ہر پھول کا رنگ قسم بہ قسم، خوشبو جدا جدا اور ساخت رنگ برنگ ہے اسی طرح ہر سلسلہ کا اپنا اپنا انداز فکر اور جدا جدا طرز عمل ہے لیکن سب کا مقصد ایک ہی ہے اور وہ ہے تقرب الہٰی، معرفت حق، انسان دوستی، خلوص و محبت اور ایثار و قربانی کا درس اور اس کے ذریعہ بقا کا مقام حاصل کر لینا اور زندہ جاوید ہو جانا ؎

ہرگز نمیرد آنکہ دلش زندہ شد بعشق
ثبت است بر جریدۂ عالم دوام ما

میں نے پہلے ہی عرض کیا ہے کہ ہر سلسلہ کا اپنا اپنا انداز فکر ہے اور اس کی اپنی مخصوص کیفیتیں اور حالتیں ہیں۔ ان کی تعلیم کا بھی مختلف طریقہ کار ہے۔ کسی سلسلہ میں داخل ہونے کے بعد سلوک کے مختلف منازل سے گذرنا پڑتا ہے تو کسی سلسلے میں داخل ہونے کے پہلے ہی ریاضت و مجاہدہ کی منزلیں طے کرنی پڑتی ہیں، کسی سلسلہ میں داخل ہونے کے لئے نہ صرف محنت شاقہ کرنی پڑتی ہے بلکہ امتحان و

آزمائش سے بھی گذرنا پڑتا ہے اور بہت کد وکاوش کے بعد داخلے کی اجازت ملتی ہے، تو بعض سلسلے ایسے ہیں جن کی رسائی میں زیادہ سلسلہ جنبانی کی ضرورت نہیں لیکن سلسلے میں داخل ہوتے ہی ان کو ایسی ایسی منزلوں سے گذرنا پڑتا ہے جس کو برداشت کرلینا مخصوصین کے بس کی بات نہیں۔ بعض سلسلے ایسے ہیں جن میں جذب ومستی کے سرور ہی سے مکیف ہوکر مقامات سلوک طے ہوجاتے ہیں۔ بعض سلسلے میں علم وعمل دونوں ہی سے متصف ہونا ضروری ہے۔ مختصر یہ کہ ہر سلسلہ کا اپنا اپنا خاص انداز فکر ہے اور اس کی تعلیمات کے مختلف روش اور مسلک ہیں لیکن سبھوں کا منبع وملجا اور مرکز رحمۃ اللعٰلمین خاتم النبیین حضرت محمد مصطفےٰ صلی اللہ علیہ وسلم کی محبت اور ان کی اتباع سنت ہے۔

اگر ہم تمام مشاہیر سلاسل اور خانوادے کی کیفیت وکمیت کا مشاہدہ کریں تو یہ صداقت بھی سامنے آتی ہے کہ ہر سلسلہ کے لئے ایک مخصوص مسلک اور اس کی تعلیمات کی منفرد نوعیت ہے۔ مثلاً سلسلہ قادریہ میں تقویٰ اور طہارت کے علاوہ شریعت کی سختی سے پابندی ہے اور باطن کی آراستگی کے لئے ظاہر پر بھی گہری نظر ہے۔ خود سیدنا حضرت محبوب سبحانی عبدالقادر جیلانی رحمۃ اللہ علیہ نے نہ صرف اس کی تعلیم دی بلکہ عملی طور سے اس کی روش پر اس سختی سے کاربند رہے کہ شریعت کے عمل سے ایک شمہ برابر بھی کوئی تضاد ہوا تو طریقت کے اس عمل سے دور رکھا۔ یہی وجہ ہے کہ سلسلہ قادریہ کی روش بہت محتاط ہے۔

سلسلہ نقشبندیہ نے تو اپنی تعلیمات میں اس سے زیادہ بڑھ چڑھ کر احتیاط کا قدم اٹھایا کہ داخل سلسلہ ہونے کے قبل ہی ریاضت ومجاہدہ کی منزلوں سے گذرنا پڑتا ہے اور یہ مراقبہ اور اذکار واشغال کے ذریعہ طالب راہ کو اس قابل بنا لیتے ہیں کہ اس سلسلہ کی تاب لاسکے اور اس کے حلقۂ ارادت میں داخل ہوکر منازل وسلوک کی راہیں طے کرسکے۔ اسی لئے ان کی تعلیم کا مسلک نظر بر قدم ہے۔ اس سلسلے کے بانی حضرت بہاء الدین نقشبند رحمۃ اللہ علیہ نے ہر طرح پر آزمائش وامتحان کی کسوٹی پر پرکھ کر اپنے سلسلہ کی ترویج واشاعت کی۔

سلسلہ چشتیہ میں تقویٰ و طہارت تو ہے لیکن اس سلسلہ کے مشائخین نے سختی نہ کی بلکہ تبلیغ اسلام اور ترویج دین و اسلام کا ایک دلکش اور پرکشش انداز تعلیم اختیار کیا۔ انہوں نے جذب و مستی اور کیف و سماع کو ایسی جاذبیت کے ساتھ پیش کیا کہ جوق در جوق اس سلسلہ میں عقیدت مند داخل ہونے لگے اور مقبولیت کا یہ عالم ہوا کہ اس کے ذریعہ اسلام کی تبلیغ و ترویج کافی ہوئی۔ اس سلسلے میں جو خصوصیں ہیں ان کو جس احتیاط کا قدم اٹھانا پڑتا ہے اور جس ایثار و قربانی سے گزرنا پڑتا ہے اس کا تصور بھی جان لیوا ہے۔ اس سلسلہ کے مشائخین کی ظاہری زندگی کچھ اور نظر آتی ہے اور باطنی زندگی کی روش اتباع سنت اور عرفان حق پر اس طرح عمل پیرا ہے کہ عقل دنگ رہ جاتی ہے خطۂ ہندوستان میں اس سلسلہ نے جو خدمات انجام دی ہیں وہ حیرت انگیز اور زندۂ جاوید ہیں۔ اس سلسلہ کا واسطہ اور رابطہ عوام الناس سے زیادہ ہے اور مقبولیت کا یہ انداز ہے کہ بلا فرق مذہب و ملت سب اس کے شیدائی ہیں۔

سلسلہ فردوسیہ کو ہندوستان میں اور بالخصوص صوبہ بہار میں کافی فروغ حاصل ہوا ہے اور اس سلسلہ کے ایک مشہور بزرگ حضرت مخدوم جہاں شیخ شرف الدین احمد یحییٰ منیری ثم بہاری رحمۃ اللہ علیہ نے اس سلسلہ کو مقبول عام بنایا اور زیادہ فروغ دیا۔ اس میں شریعت کی پابندی کے ساتھ ساتھ علم و عمل کی آراستگی بھی لازمی ہے۔ خود حضرت مخدوم جہاںؒ بہت بڑے صاحب علم اور صاحب تصانیف تھے۔ اس لئے انہوں نے علم پر زیادہ زور دیا اور شریعت کی پیروی لازمی قرار دی۔ امیر المومنین امام المتقین حضرت سیدنا علی کرم اللہ وجہہ کی تعلیمات من عرف نفسہٗ فقد عرف ربہٗ کی اس طرح تعلیم دی گئی ہے کہ اس سلسلہ کے مشائخین علم ظاہری و باطنی سے آراستہ ہونے کے باوجود اپنے ذات میں اس طرح گم ہیں کہ گمنام پسندی ان کا خاص سلک ہو گیا ہے۔

سلسلہ سہروردیہ کی ابتدا تو عراق کے قصبہ سہرورد سے ہوئی لیکن ترویج و اشاعت بغداد میں زیادہ ہوئی۔ اس لئے کہ حضرت شیخ الشیوخ کا قیام زیادہ تر بغداد

ہی میں رہا۔ ہندوستان میں ملتان، بنگال، بہار، یوپی اور مدھیہ پردیش میں اس کی وسعت کافی ہوئی۔ اس سلسلے میں علم و عمل دونوں پر توجہ دی جاتی ہے لیکن پیروی رسول اور محبت رسول پر زیادہ زور ہے۔ پیروی راہ حق اور اتباعِ مسلکِ خیر اصول ہیں۔ حضرت شیخ الشیوخؒ عوارف المعارف ص۴۵ میں فرماتے ہیں کہ:۔

"ہمارے شیخ، شیخ الاسلام ابونجیب سہروردی اکثر فرمایا کرتے تھے کہ میرا فرزند وہی ہے جو میرے طریقہ پر چلے اور میری راہ ہدایت اختیار کرے۔"

مختصر یہ کہ اس طرح پر تمام سلاسل میں اپنے اپنے انداز فکر سے روش و مشرب پر زیادہ زور ہے۔ کسی سلسلہ میں شریعت و طریقت کے ساتھ تقوی و طہارت کی زیادہ پابندی ہے تو کسی میں وجد و سماع اور کیف و سرور کا زیادہ خیال۔ کسی سلسلے میں علم و عمل کے شغف کے ساتھ ساتھ استتار اور گمنام پسندی پر زیادہ توجہ ہے تو کسی میں ریاضت و مجاہدہ کی زیادہ لگن ہے۔ کسی میں ذکر و شغل اور مراقبہ کی زیادہ سے زیادہ تعلیم ہے تو کسی میں تسلیم و رضا اور ایثار و قربانی کا درس، کوئی بظاہر مخلوق کی ملامت سے مست قلندر، غرض کہ تمام سلسلے میں اپنی اپنی کیفیت و کمیت کے لحاظ سے تعلیم دی جاتی ہے۔

صوفیائے کرام کے یہ سلاسل تذکرۂ مشائخ اور صوفیائے کرام کے تصانیف اور قلمی سفینوں میں مختلف طریقوں پر جمع کئے گئے ہیں۔ بعض صوفیا نے طبقات کے اعتبار سے ترتیب دیا ہے تو بعض نے وطنیت کے اعتبار سے

بعض مشائخین نے زمانے کے اعتبار سے تو بعض نے تعلیمات اور روش کے اصول سے۔ اس لئے سلاسل کی تاریخ میں کوئی ربط و تسلسل اور ہم آہنگی نہیں۔

عربی میں تصوف کی اہم ترین تصنیف طاؤس الفقراء، حضرت شیخ ابونصر سراج رحمۃ اللہ علیہ (وفات ۳۷۸ ہجری)[۵] کی تصنیف کتاب اللمع ہے۔ لیکن فارسی میں تصوف کی

---

[۵] آپ کا وطن طوس ہے اور آپ کا مرقد بھی اسی سرزمین میں ہے۔ ۳۷۸ھ میں حالت خمار میں وفات پائی۔ آپ کے پیر و مرشد حضرت ابو محمد مرتعش نیشاپوری ہیں۔ سری سقطی سے بھی ملاقات ہے۔

قدیم ترین کتاب حضرت شیخ علی بن عثمان ہجویری عرف داتا گنج بخش لاہوری رحمۃ اللہ علیہ[1] کی تصنیف کشف المحجوب ہے۔ یہ تصنیف تیرہ ابواب پر مشتمل ہے۔

---

[1] آپ کا وطن غزنی (افغانستان) تھا۔ ہجویر و جلاب دو قریئے مضافات غزنی کے ہیں، قیام دونوں میں رہا۔ آخر عمر میں اپنے مرشد شیخ ابوالفضل بن حسن ختلیؒ مرید شیخ حسن خضری کے حکم سے لاہور تشریف لائے اور یہاں سکونت اختیار کی۔ اپنے معاصرین میں سلطان ابوسعید ابوالخیرؒ، شیخ ابوالقاسم قشیریؒ، شیخ ابوالقاسم گرگانیؒ وغیرہم سے ملاقات تھی۔ حنفی المذہب تھے۔ سیر و سیاحت میں اکثر رہا کرتے۔ شام سے لے کر ترکستان تک، اور ساحل سندھ سے لے کر بحر قزوین تک یعنی اپنے زمانے کی تقریباً ساری اسلامی عملداری کی سیاحی کی ہے۔

فوائد الفوائد۔ ص ۳۵ ملفوظ حضرت نظام الدین اولیاء دہلویؒ میں تحریر ہے کہ علی ہجویری اور شیخ حسین زنجانی دونوں ایک ہی مرشد سے بیعت تھے۔ شیخ حسین زنجانی عرصہ سے لاہور میں سکونت رکھتے تھے۔ ایک روز شیخ علی ہجویری کو مرشد کا حکم ملا کہ لاہور میں سکونت اختیار کرو۔ عرض کیا کہ وہاں تو شیخ حسین پیشتر سے موجود ہیں۔ مکرر ارشاد ہوا کہ تم جاؤ۔ تعمیل کی۔ شب میں لاہور پہنچے۔ اسی شب میں شیخ حسین نے انتقال کیا —— عام لقب جو گنج بخش چلا ہوا ہے اس کی بابت روایت ہے کہ حضرت خواجہ معین الدین چشتی حسن سنجری اجمیری رحمۃ اللہ علیہ نے آپ کے مزار مبارک پر آکر حسب دستور چلہ کشی کی اور فیض و برکت سے مالامال ہو کر جب رخصت ہونے لگے تو مزار کے رخ کھڑے ہو کر یہ شعر پڑھا ؎

گنج بخش ہر دو عالم مظہرِ نورِ خدا ۔۔۔ کاملاں را پیر کامل ناقصاں کا رہنما

آپ کا سال وفات ۴۶۵ھ ہے۔ مزار مبارک پر جو قطعہ تاریخ کندہ ہے اس پر بھی یہی تاریخ درج ہے۔ آپ کی تصانیف کثرت سے ہیں لیکن اب معدوم ہیں البتہ کشف المحجوب کو بڑی شہرت حاصل ہے اور اس کو پروفیسر نکلسن نے ایڈٹ کیا ہے۔

علم معرفت، فضائل فقر، طبقات صوفیہ، تعریف تصوف، اہل تصوف کے خصوصیات مرقع پوشی، (یعنی گدڑی پہننے کی فضیلت) فقر اور صفا دونوں میں افضل کون ہے، کی بحث۔ طریقۂ ملامت اور سلسلۂ ملامت، خلفائے عرب خاندان نبوی کے اخلاف، صالحین کے کمال ومناقب، اصحاب صفہ کے حالات تابعین میں صوفیہ کے پیشوا اور تبع تابعین میں مختلف بزرگوں کے تذکرے، متاخرین صوفیہ میں دس بزرگوں کے حالات قابل ذکر ہیں۔ تیرہویں باب میں جو ماقبل باب کا تکملہ ہے، اس میں معاصرین صوفیہ کا تذکرہ ہے اور ان کے طبقات کو ان کی وطنیت کی بنا پر تقسیم کیا گیا ہے۔ مثلاً صوفیائے شام وعراق، صوفیائے پارس، صوفیائے قہستان آذربائجان وطبرستان، صوفیائے کرمان، صوفیائے خراسان صوفیائے ماوراء النہر، صوفیائے غزنی کا ذکر ہے۔ کشف المحجوب کا سب سے طویل باب چودہواں باب ہے اس میں صوفیا کے مختلف سلسلے اور ان کے اصول اور باہمی اختلافات کا ذکر ہے۔ اس وقت تک حضرت شیخ علی ہجویری کے خیال میں کل بارہ سلسلے تھے۔ ان میں سے دس مقبول اور اہل حق تھے اور باقی دو مردود اور اہل باطل تھے۔ دس مقبول سلسلوں کے نام مع ان کے بانیوں کے حسب ذیل ہیں:۔

١۔ محاسبیہ ۔ عبداللہ بن حارث محاسبیؒ

٢۔ قصاریہ ۔ ابو حمدان قصارؒ

٣۔ طیفوریہ ۔ بایزید بسطامیؒ

۴۔ جنیدیہ ۔ جنید بغدادیؒ

۵۔ نوریہ ۔ ابوالحسن نوریؒ

٦۔ سہیلیہ ۔ سہیل تستریؒ

٧۔ حکیمیہ ۔ حکیم ترمذیؒ

٨۔ خرازیہ ۔ ابو سعید خرازؒ

٩۔ خفیفیہ ۔ ابو عبداللہ خفیفؒ

۱۰۔ سیاریہ۔ ابو العباس سیاریؒ

گیارہویں سلسلہ کا نام جو مردود ین اور اہل ضلالت کا ہے سلسلۂ حلولیہ ہے۔ اس کا بانی ابو حلمان دمشقی ہوا ہے۔ بارہویں سلسلہ کا نام کہ وہ بھی مردود ہے، درج کتاب نہیں۔ اس کا انتساب فارس کی جانب کیا جاتا ہے۔
(تصوف اسلام: مصنفہ عبدالماجد دریا آبادی صفحہ ۴۲)

اگرچہ تذکرۂ مشائخ کثرت سے لکھے گئے۔ تذکرۃ الاولیاء مصنفہ فریدالدین عطار۔ نفحات الانس مصنفہ عبدالرحمٰن جامی۔ مراۃ الاسرار مصنفہ عبدالرحمٰن چشتی، گلزار ابرار مصنفہ محمد غوثی شطاری، کلمات الصادقین مصنفہ محمد صادق ہمدانی، اخبار الاصفیاء مصنفہ عبدالصمد، گنج رشیدی ملفوظ حضرت دیوان محمد رشید جون پوریؒ، گنج ارشدی ملفوظ حضرت دیوان ارشد جونپوریؒ گنج فیاضی ملفوظ حضرت ابوالفیاض غلام رشید جون پوری ہیں۔ بزرگوں کے تذکرے تو ہیں لیکن سلاسل کے اعتبار سے تقسیم نہیں۔ البتہ اخبار الاخیار مصنفہ عبدالحق محدث دہلوی میں مشائخ کے حالات کی ترتیب سلسلوں کے اعتبار سے نہیں ہے بلکہ کل مشائخ کو زمانہ کے لحاظ سے تین طبقوں میں تقسیم کر لیا گیا ہے۔

(۱) طبقہ اوّل : از خواجہ معین الدین چشتیؒ تا شیخ فخر الدین فرزند خواجہ بزرگؒ
(۲) طبقہ دوم : از بابا فرید گنج شکرؒ تا مولانا احمد حافظؒ
(۳) طبقہ سوم : از شیخ نصیرالدین چراغ دہلویؒ تا مولانا بخشیؒ [۱]

سفینۃ الاولیاء میں شہزادہ دارا شکوہ نے سلاسل کے اعتبار سے اپنی تصنیف کو ترتیب دینے کی کوشش کی ہے لیکن اس میں بھی دوسرے سلاسل کے بزرگوں کے حالات خلط ملط ہو گئے ہیں اور سلاسل کے بزرگوں کو واضح طور پر پیش نہیں کیا ہے۔ پھر بھی سلسلے کی تقسیم اس طرح پر کی ہے:۔

---

[۱] حیات شیخ عبدالحق محدث دہلویؒ مصنفہ خلیق احمد نظامی صفحہ ۲۰۰

(۱) سلسلۂ عالیہ قادریہ (۲) سلسلۂ شریفہ خواجگان بزرگوار
(۳) سلسلۂ شریفہ چشتیہ (۴) سلسلۂ کبرویہ
(۵) سلسلۂ سہروردیہ (۶) متفرقہ

کے عنوان سے مشائخین کے احوال قلم بند کئے ہیں۔ البتہ بزرگوں کے سفینوں میں اپنے اپنے طور پر سلسلے کے اعتبار سے بزرگوں کے نام نامی اور احوال درج ہیں۔

سلسلہ شطاریہ کے مشہور بزرگ حضرت ابو الفیض قاضن علا شطاری رح نے معدن الاسرار میں چہاردہ خانوادہ کے نام سے ان تمام سلاسل کو موسوم کیا ہے ابو الفضل نے اپنی تصنیف آئین اکبری میں ہندوستان میں چودہ سلاسل کا ذکر کیا ہے۔ ۵

(۱) حبیبیاں (۲) طیفوریاں (۳) کرخیاں (۴) سقطیاں (۵) جنیدیاں (۶) گازرونیاں (۷) طوسیاں (۸) فردوسیاں (۹) سہروردیاں (۱۰) زیدیاں (۱۱) عیاضیاں (۱۲) ادھمیاں (۱۳) ہبریاں (۱۴) چشتیاں۔

حیرت ہے کہ ابو الفضل نے بھی سلسلہ قادریہ جیسے مشہور سلسلہ کے نام کو نظر انداز کر دیا ہے اور اس کی شمولیت دوسرے میں کر دی۔

بعض تذکرہ نگاروں نے صرف چار مشہور سلاسل کا تذکرہ کیا ہے تو بعض نے چھ مشہور سلاسل کا ذکر کیا ہے۔ حیرت ہے کہ پروفیسر خلیق احمد نظامی نے ہندوستان میں صرف چھ سلاسل کا تذکرہ کیا ہے اور کہا ہے کہ ہندوستان میں صرف مندرجہ ذیل چھ ہی سلاسل نے کام انجام دیئے اور وہ ہیں (۱) چشتیہ (۲) سہروردیہ (۳) قادریہ (۴) شطاریہ (۵) نقشبندیہ (۶) فردوسیہ۔ لیکن یہ تینوں سلسلے 'سلسلہ ابو العلائیہ' سلسلہ زاہدیہ اور سلسلہ قلندریہ کی شہرت و عظمت اور مقبولیت کم نہیں ہے۔

---

۵ آئین اکبری مرتبہ سید احمد خاں حصہ دوم ص ۲۰۳

بزرگوں کے قلمی سفینوں میں اپنے اپنے طور پر سلاسل کے اعتبار سے صوفیائے کرام کے نام نامی تحریر ہیں۔ ہمارے خاندان میں ان تمام سلاسل کو ۱۹ خانوادوں میں تقسیم کیا گیا ہے اور اس کی مرکزی حیثیت بھی پیش کی گئی ہے، جس سے یہ سلاسل مشہور ہوئے ہیں۔ بعد میں ان سلاسل کی مختلف شاخیں پیدا ہوئی ہیں، اور اس لئے بھی کہ اس سلسلے میں جس بزرگ کی زیادہ شہرت اور وسعت ہوئی ہے، انہیں سے وہ سلسلہ منسوب کر دیا گیا۔ جیسے سلسلہ قادریہ میں قادریہ شمسیہ، قادریہ طیبیہ، قادریہ احمدیہ۔ سلسلۂ چشتیہ میں چشتیہ صابریہ، چشتیہ نظامیہ، چشتیہ اشرفیہ اسی طریقے سے نقشبندیہ مجددیہ، فردوسیہ سے فردوسیہ بلخیہ، فردوسیہ دولتیہ وغیرہ۔ غرض کہ اسی طرح جن بزرگوں سے اس سلسلے کی وسعت اور شہرت زیادہ ہوئی ہے انہیں کی ذات کا اضافہ کر دیا گیا ہے لیکن یہ تمام سلاسل اسی ایک سلسلہ کی شاخ ہیں۔ ان تمام سلاسل کا مطمح نظر و مکتب خیال رشد و ہدایت کے اہم فریضے کو انجام دینا ہے اور اس طرح عرب و عجم کے اکثر مقامات میں اس کی ترویج و اشاعت ہوئی۔ یہ تمام سلاسل اسی ذات اقدس سے موسوم ہیں جن سے ان کا آغاز ہوتا ہے اور اس کا طرز فکر اور لائحہ عمل مختلف رنگ روپ میں اجاگر ہوتا ہے۔ اب ان تمام سلاسل پر جو راقم الحروف کے خاندانی سفینے میں موجود ہیں، ایک طائرانہ نظر ڈالی جاتی ہے۔

۱۔ سلسلہ قادریہ سلسلہ قادریہ جسے ام السلاسل بھی کہتے ہیں۔ غوث پاک حضرت سیدنا محبوب سبحانی عبد القادر جیلانی رحمۃ اللہ علیہ سے منسوب ہے۔[۱]

---

[۱] آپ کی ولادت باسعادت ۴۷۰ھ نواح طبرستان میں قصبہ گیلان میں ہوئی۔ آپ کی وفات ۵۶۱ھ میں بغداد شریف میں ہوئی اور یہیں آپ مدفون ہوئے۔ آپ کا مزار مبارک مرجع خلائق ہے۔ بغداد شریف میں آپ کا عرس ۱۱ ربیع الثانی کو ہوتا ہے۔ آپ مرید شیخ حماد باس رحمۃ اللہ علیہ سے ہیں۔ مرشد حضرت شیخ ابو سعید مبارک مخزومی اور اپنے والد و مرشد (بقیہ اگلے صفحہ کے حاشیہ پر)

اس سلسلہ میں شریعت کی بڑی پابندی ہے اور مکروہات دنیا سے کنارہ کشی، ریاضت و مجاہدہ اور تسلیم و رضا کی منزلوں سے گذرنا پڑتا ہے۔ حضرت غوث پاکؒ نے اپنی تصنیف فتوح الغیب میں اس سلسلہ کی تعلیم دی ہے۔ مقالہ اول ص ۹-۱۰ میں تحریر ہے کہ:

ترجمہ: "ہر مومن کے لئے ہر حال میں یہ تین چیزیں لازمی ہیں، ایک یہ حکم الہٰی کی تعمیل کرے، دوسرے یہ کہ ممنوع سے بچتا رہے، تیسرے یہ کہ قضائے الہٰی پر راضی رہے۔ پس مومن کے لئے کم سے کم مرتبہ یہ ہے کہ ان تینوں چیزوں سے خالی نہ ہو۔"

باب ۵، میں حضرت شیخ عبد القادر جیلانیؒ نے اپنے فرزند سیف الدین عبد الوہاب کو وصیت فرمائی ہے اور دستور العمل بتایا ہے۔ جس سے انسان عارف کامل بن سکتا ہے۔ اس میں پابندیٔ شریعت، پیرویٔ سنت، ضبط نفس اور مجاہدہ اور ادائے حقوق العباد کی تعلیم دی گئی ہے۔ ملاحظہ ہو:

"میں وصیت کرتا ہوں کہ اللہ کا تقویٰ اور اطاعت اختیار کرو اور احکام شریعت کی پابندی لازم رکھو اور سینہ کو (خباثت نفس سے) صاف رکھو اور نفس میں جوانمردی رکھو، اور کشادہ رو رہو اور جو شئی عطا کرنے کے قابل ہو اسے عطا کرتے رہو، اور آداب درویشی نگاہ میں رکھو اور بزرگوں کی بزرگ داشت کرتے رہو، برابر والوں سے حسن معاشرت رکھو، خردوں کو نصیحت کرتے رہو،

(پچھلے صفحہ کا حاشیہ) حضرت موسیٰ صالح جنگی دوستؒ ہیں۔ یہ نسبت روحانی براہ راست سرور دو عالم صلی اللہ علیہ وسلم سے تھی۔ فن سلوک پر آپ کی مشہور تصنیف فتوح الغیب ہے۔ یہ ۷۸ مقالوں پر مشتمل ہے۔ جن میں اوامر و نواہی، اتباع سنت و ترک بدعت، تسلیم و رضا، صدق و اخلاص محاسبہ و مجاہدہ، طریق تصوف، طریقت کی بنیاد پر روشنی ڈالی گئی ہے۔

اپنے رفیقوں سے جنگ نہ کرو، ایثار کو اپنے اوپر لازم کرلو، ذخیرہ مال فراہم کرنے سے بچو۔" ؎۱

اس سلسلے کی ترویج و اشاعت بغداد سے ہوئی اور اسلامی دنیا میں اس کی وسعت اور شہرت اس قدر ہوئی کہ عرب و عجم یعنی مدینہ منورہ ہو یا ایران افغانستان ہو یا ہندوستان غرض کہ ہر جگہ بالخصوص ہندوستان میں اس کی اتنی وسعت و مقبولیت ہوئی کہ کوئی بھی بڑی یا چھوٹی خانقاہ ایسی نہیں ہے جس میں اس کی ترویج و اشاعت نہ ہوئی ہو۔ اور اس سلسلے کی مقبولیت کا یہ عالم ہے کہ حضرت شیخ موصوف کا جس ماہ میں وصال ہوا ہے وہ مہینہ گیارہویں شریف کے نام سے مشہور ہے۔ اور ہر خاص و عام اس سلسلے کا معترف اور معتقد۔ عبدالماجد دریا آبادی نے اپنی تصنیف میں تحریر فرمایا ہے کہ

"اگر یہ سوال کیا جائے کہ صوفیائے کرام کے سارے سلسلوں میں شہرت عام اور مقبولیت انام سب سے زیادہ کس کے حصہ میں آئی ہے؟ تو عجب نہیں کہ متفقہ طور پر نام حضرت شیخ جیلانیؒ کا زبانوں پر آ رہا ہے۔ دوسرے بزرگوں کے حلقے پھر بھی محدود ہیں۔ شیخ جیلانیؒ کا نام خواص و عام سب کی زبان پر ہے۔" ؎۲

اس سلسلہ قادریہ کی وسعت و ترویج و اشاعت ان کے صاحبزادوں اور خلفاء کے ذریعہ زیادہ ہوئی۔ جن میں حضرت عبدالوہابؒ، حضرت عبدالرزاقؒ، حضرت عبدالعزیزؒ بن عبدالقادر جیلانیؒ، حضرت عبدالقادر نجیب الدین سہروردیؒ، حضرت شیخ الشیوخ، حضرت ابو ابراہیم المقدسیؒ وغیرہم سے ہوئی۔ مشہور ہے کہ آپ کے ایک صاحبزادے سندھ میں بھی آئے جن کا مزار مبارک وہاں ہے، اور بہار میں حضرت سید احمد انجھریؒ، حضرت قمیص قادریؒ، حضرت پیر مجیب اللہؒ وغیرہ سے

؎۱ فتوح الغیب ص۳۹۵ از تصوف اسلام، مصنفہ عبدالماجد دریا آبادی ص۱۱۱

؎۲ تصوف اسلام ص۹۶

زیادہ ہوئی۔ عہد مغلیہ میں حضرت شیخ عبدالحق محدث دہلویؒ نے اس سلسلہ کو بہت فروغ دیا۔

۲۔ سلسلہ چشتیہ

سلسلہ چشتیہ کی نسبت حضرت ابو اسحاق چشتیؒ[1] سے ہے۔ لیکن شہزادہ دارا شکوہ نے اپنی تصنیف سفینۃ الاولیار میں حضرت ابو اسحاق چشتیؒ کے مرید اور جانشین حضرت خواجہ ابو احمد چشتیؒ کو حلقہ سلسلہ چشتیہ کا سردار لکھا ہے۔ اس سلسلے کی ترویج و اشاعت مقام چشت سے شروع ہوئی اور سنجان، دمشق، سجستان، خراسان اور نیشاپور سے ہوتی ہوئی ہندوستان پہنچی۔ اور ہندوستان میں اس سلسلے کو فروغ حضرت خواجہ غریب نواز معین الدین چشتی اجمیریؒ کی ذات گرامی سے ہوا۔ اس سلسلے میں ظاہر سے زیادہ باطن پر زور ہے۔ وجد و سرمستی پیدا کرنے کے لئے مجلس سماع سے کام لیتے ہیں۔ اس لئے اس سلسلے میں مجلس سماع اور قوالی کا زیادہ شغف ہے۔ اس سلسلے کے معتقد بلا فرق مذہب و ملت ہندوستان کے عوام و خواص دونوں ہیں۔ تمام سلاطین ہند بھی چشتی بزرگوں کے آستانے کی حاضری کو اپنے لئے موجب سعادت سمجھتے رہے ہیں۔ ان کی خانقاہوں اور مزاروں پر عوام و خواص دونوں ہی میں محبت اور عقیدت کی جھلک نظر آتی ہے۔ اس سلسلے کی اشاعت شمالی ہند اور جنوبی ہند میں کثرت سے ہوئی۔ حضرت بابا گنج شکرؒ، حضرت شیخ نظام الدین اولیاءؒ، حضرت علاء الدین احمد صابر کلیریؒ اور آپ کے خلفاء سے اس سلسلے کی کافی شہرت ہوئی۔ دہلی میں حضرت نصیر الدین چراغ دہلویؒ سے اور آپ کے جانشین سید محمد بندہ نواز گیسو درازؒ سے گلبرگہ شریف دکن میں اس کی کافی مقبولیت ہوئی اور جنوبی ہند میں چشتی بزرگوں نے اس سے اپنے سلسلے کو بڑی وسعت دی۔ صوبہ بنگال میں حضرت علاء الحق پنڈویؒ اور آپ کے صاحبزادے حضرت نور قطب عالم پنڈویؒ سے

---

[1] آپ کی ولادت باسعادت ۲۶۰ھ میں ہوئی اور وفات ۱۰ جمادی الآخر ۳۵۵ھ میں ہوئی۔ آپ کا مزار مبارک مقام چشت میں ہے۔ آپ سلطان فرسنافہ کے صاحبزادے تھے۔ شیخ ابو اسحاق چشتی شامیؒ کے مرید ہیں۔

اس سلسلے کو بہت فروغ ہوا۔ حضرت علاء الحق رحؒ کے خلیفہ و مجاز حضرت مخدوم حسام الحق مانک پوریؒ اور ان کے مرید و مجاز حضرت راجے سید حامد مانکپوریؒ اور فتح اللہ اودھیؒ سے یوپی کے خطہ کو فروغ ہوا۔ حضرت مخدوم طیب بنارسیؒ اور حضرت دیوان محمد رشید جون پوریؒ کی ذات گرامی کے ہاتھوں اس کی شہرت ہندوستان گیر طور پر ہوئی۔ صوبہ بہار میں بھی حضرت آدم صوفی خلیفہ مجاز حضرت بابا فرید الدین گنج شکرؒ کی درگاہ جیو ٹھلی، حضرت فرید الدین طویلہ بخش خلیفہ مجاز نور قطب عالم پنڈوی، حضرت جمال الحق بندگی مصطفےٰ، چمنی بازار پورنیہ وغیرہ کے ذریعہ اس سلسلے کی ترویج زیادہ ہوئی اور اس سلسلے کے اخلاق حسنہ اور فیضان عام نے خواص و عوام کو اپنا گرویدہ بنا ڈالا۔

۳۔ سلسلہ سہروردیہ

حضرت شیخ ضیاء الدین ابو نجیب سہروردیؒ کے برادر زادہ و مرید جانشین حضرت شیخ الشیوخ شہاب الدین سہروردیؒ[1] سے سلسلہ سہروردیہ منسوب اور مشہور ہے۔ آپ مشہور عارف اور صاحب تصنیف بزرگ ہوئے ہیں۔

---

[1] آپ کی ولادت باسعادت ۵۲۹ھ میں ہوئی اور وفات ۶۳۲ھ میں۔ مزار بغداد میں ہے، اور مرجع خلائق۔ آپ کا سلسلۂ نسب ۱۲ واسطوں سے حضرت سیدنا ابوبکر صدیق رضی اللہ عنہ تک پہنچتا ہے۔ حضرات صوفیا میں ایک مسلم امام سمجھے گئے ہیں۔ آپ کے چچا حضرت نجیب الدین سہروردیؒ جب آپ کی طبیعت کا رجحان علم کلام کی جانب دیکھا اور کسی دوسرے اثر کو قبول کرنے کے لئے طبیعت تیار نہ تھی تو ایک روز حضرت محبوب سبحانی عبدالقادر جیلانیؒ کی خدمت میں ان کو لے کر حاضر ہوئے۔ حضرت محبوب سبحانیؒ نے شیخ الشیوخ سے مخاطب ہو کر پوچھا "عمر کون کون سی کتابیں پڑھی ہیں؟ انھوں نے نام گنوائے، حضرت نے سن کر اپنا دست مبارک ان کے سینے پر پھیرا۔ ہاتھ کا پھیرنا تھا کہ بخدا ایک لفظ بھی مجھے ان کتابوں کا یاد نہ رہا۔ خدا نے تمام مسائل کلامیہ میرے دل سے محو کر دیئے اور قلب کو علم لدنی سے لبریز کر دیا۔ علوم ظاہری و باطنی کے جامع تھے۔ فقیہہ فاضل تھے، صوفی متقی تھے، زاہد عارف تھے۔ اپنے زمانے میں علم طریقت کے شیخ تھے۔ تربیت مریدین میں کامل تھے۔ (تصوف اسلام ص ۱۱۵)

آپ کی مشہور تصنیف عوارف المعارف ہے۔ جس کا سن تصنیف ۵۶۰ھ ہے۔ یہ کتاب فن تصوف پر گراں قدر تصنیف ہے اور گروہ صوفیا میں مستند تسلیم کی جاتی ہے۔ بلکہ صوفیائے متاخرین کے سلوک و منازل کی تعلیم کا گراں قدر ماخذ ہے۔ اس کتاب کے دو حصے ہیں۔ حصہ اول میں ۳۲ ابواب اور حصہ دوم میں ۳۱ ابواب کل ۶۳ ابواب ہیں اس میں علم تصوف ابتدا اور تاریخ ماہیت تصوف، مصنوعی اہلِ تصوف، مرتبہ شیخیت اہلِ خانقاہ، سماع اور اس کے آداب و شرائط، اخلاق صوفیہ وغیرہ مضامین پر مشتمل ہیں۔ اکثر صوفیا کی طرح شیخ الشیوخ بھی کتاب اللہ اور سنت رسول پر عمل پیرا ہونے کی تعلیم اس سلسلے میں دیتے ہیں۔ شیخ الشیوخ کے نزدیک تصفیہ قلب اور تزکیہ نفوس، براہ راست تعلیم مصطفوی کا ثمرہ ہے اور جو شخص اس سرچشمہ رشد و ہدایت سے جتنا زیادہ سیراب ہوا اسی قدر صفائے قلب تزکیہ نفس سے بھی وہ زیادہ بہرہ اندوز ہوا۔ اس سلسلہ میں پیروی رسول اور محبت الٰہی کی تعلیم دی گئی ہے بلکہ پیروی رسول عین محبت الٰہی ہے۔ جیسا کہ "عوارف المعارف" ص۲۶ میں تحریر فرماتے ہیں:۔

"پس جو شخص جتنا زیادہ متبع رسول صلعم ہے اسی قدر زیادہ وہ محبت الٰہی کا بھی حصہ دار ہے اور صوفیا ہی نے اسلامی گروہوں میں سب سے زیادہ بڑھ کر اتباعِ رسول کی ہے۔"

عوارف المعارف رہروانِ تصوف کے لئے مشعل راہ ہے۔ اس سلسلے کی مقبولیت نہ صرف دمشق، بخارا اور سہرورد میں ہوئی بلکہ صوبہ پنجاب کے مشہور خطہ ملتان میں حضرت شیخ الشیوخ کے خلیفہ و مجاز حضرت بہاء الدین زکریا ملتانیؒ کے ذریعہ ہوئی۔ بنگال میں حضرت شیخ الشیوخ کے دوسرے خلیفہ حضرت خواجہ احمد دمشقیؒ اور اس سلسلہ کے مشہور بزرگ حضرت مخدوم جہانیاں جہاں گشت جلال الدین بخاریؒ کے ذریعہ اس کو کافی فروغ ہوا۔ اس سلسلہ کے دوسرے مشہور بزرگ امیر کبیر سید علی ہمدانیؒ بھی ہیں جن کے ذریعہ خطۂ کشمیر میں اس کی وسعت اور شہرت ہوئی۔ صوبہ بہار میں حضرت مخدومِ جہاں شیخ شرف الدین یحییٰ منیریؒ کے نانا حضرت شہاب الدین پیر جگ جوتؒ،

کچھ درگاہ جیٹھلی عظیم آباد اور منیر شریف میں حضرت مخدوم جہاں کے والد حضرت مخدوم احمد یحییٰ منیریؒ بہار شریف میں حضرت مخدوم احمد چرم پوش سہروردیؒ مشہور سہروردی بزرگ ہیں اور ان کے ذریعہ اس سلسلہ کو زیادہ فروغ ہوا۔ قطب الاقطاب حضرت غریب اللہ حسین دھکڑ پوشؒ، حضرت مخدوم ضیاء الدین صوفی چنڈھوسی اور حافظ منجھن جلالی ناصحی سارنیؒ نے اس سلسلہ کو مقبول عام و خاص بنایا۔

۴۔ سلسلہ کبرویہ سلسلہ کبرویہ جس کی نسبت طریقت و تصوف میں یکتائے روزگار حضرت نجم الدین کبریٰ ولی تراشؒ سے ہے۔ حضرت نجم الدین

لہ آپ کی ولادت تقریباً ۵۵۰ھ میں ہوئی۔ تاتاریوں کے فتنہ میں بمقام خوارزم خدا کی راہ میں جہاد کرتے ہوئے آپ کی شہادت ہوئی۔ حضرت خواجہ نجم الدین کا نام احمد بن عمر الصوفی ہے۔ آپ کی کینت ابوالجناب ہے۔ یہ کینت آپ کو آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم سے خواب میں عطا ہوئی تھی۔ آپ کا لقب کبریٰ ہے اور کبریٰ اسی وجہ سے کہتے ہیں کہ عنفوانِ شباب میں جب آپ تحصیل علوم میں مشغول تھے جس کسی سے مناظرہ یا مباحثہ کرتے اس پر غالب آتے اس سبب سے آپ کو طامۃ الکبریٰ کہنے لگے۔ کثرت استعمال سے طامۃ حذف ہو کر صرف کبریٰ باقی رہ گیا۔ آپ کو شیخ ولی تراش بھی کہتے ہیں اس مناسبت سے کہ حالت وجد میں جس پر آپ کی نظر پڑ جاتی وہ درجۂ ولایت تک پہنچ جاتا۔ آپ حدیث کے امام تھے آپ کے حلقۂ صحبت میں عجیب تاثیرات و برکات تھیں۔ دور دراز سے طالبانِ حق حاضر خدمت ہو کر فیض یاب ہوتے تھے۔ آپ بڑے محدث اور مفسر بھی تھے۔ بارہ جلدوں میں قرآن کی تفسیر لکھی تھی۔ آپ تبریز میں امام بغوی کے ایک شاگرد سے ان کی شرح السنہ پڑھتے تھے۔ حضرت بابا فرح کی ایک عقدہ کشا نگاہ نے حالت درس ہی میں آپ کی حالت متغیر کردی۔ اور بابا فرح تبریزیؒ نے آپ کو اپنا خرقہ پہنایا۔ حضرت شیخ نجم الدین کبریٰؒ کامل سات مہینہ حضرت ابو نجیب عبدالقاہر سہروردیؒ کی صحبت و تربیت میں رہے۔ کچھ دنوں آپ نے قصبہ سنجار میں بھی اقامت فرمائی تھی۔ (بقیہ اگلے صفحہ پر)

کبریٰ، حضرت ابونجیب عبدالقادر سہروردی کے مرید اور مجاز و خلیفہ تھے۔ تذکرۂ مشائخ میں تحریر ہے کہ حضرت ابونجیب نے علم طریقت کے اسرار و رموز آپ پر منکشف کئے، مرید کیا اور خلافت و اجازت مرحمت فرمائی۔ پھر پیشوائے مشائخ عالم بنا کر رشد و ہدایت کے لئے رخصت فرمایا۔ آپ بڑے محدث ہونے کے ساتھ ساتھ بڑے مفسر بھی تھے۔ آپ کی تعلیمات میں تقویٰ اور تفقہ کے ساتھ ساتھ علم شریعت اور طریقت پر بھی زیادہ زور رہے۔ سلسلہ کبرویہ کو اتنا فروغ ہوا کہ مقام خوارزم میں آپ کی خانقاہ میں بیک وقت چھ ہزار مریدین راہ طریقت کی تعلیم حاصل کرتے تھے۔ چونکہ آپ بہت بڑے صاحب علم تھے اس لئے آپ کے سلسلے میں علم کا شغف زیادہ ہے۔ آپ کے سلسلے سے راہِ طریقت کی ایک نئی شاخ پھوٹی اور وہ سلسلۂ فردوسیہ کے نام سے موسوم ہوئی یعنی آپ کے مرید و جانشین حضرت سیف الدین باخرزیؒ اور ان کے مرید و جانشین خواجہ بدرالدین سمرقندیؒ اور ان کے مرید و جانشین حضرت خواجہ رکن الدین فردوسی سے سلسلۂ فردوسیہ کا آغاز ہوا اور اس نے اس سلسلے کو کافی فروغ دیا۔ یہ سلسلہ سہروردؔ، سمرقند اور خوارزم تک تو بہت پھیلا لیکن ہندوستان میں اس نے فردوسیہ کا رنگ روپ اختیار کر لیا۔

(پچھلے صفحہ کا حاشیہ) چنانچہ حضرت خواجہ معین الدین چشتیؒ نے اپنے سیر سلوک کے زمانے میں وہیں آپ سے ملاقات کی اور صحبت سے مستفیض ہوئے۔ آپ نے حضرت شیخ اسماعیل قصری سے فیض پایا۔ اور اجازت و خلافت حاصل کی۔ چنانچہ سلسلۂ کمیلیہ یعنی کمیل بن زیادؒ کے سلسلہ کی اجازت آپ ہی کے واسطے سے حضرت نجم الدین کبریٰ نے شہاب الدین سہروردی کو عطا فرمایا۔ دوسری نسبت آپ کو شیخ عمار یاسر سے حاصل ہے جو شیخ ابوقاسم گرگانی پر ختم ہوتی ہے۔ تیسری نسبت حضرت روزبہان مصری سے ہے آپ حضرت روزبہان مصریؒ کی بھی خانقاہ میں پہنچے اور ان تینوں کی خانقاہوں میں برسہا برس رہے ہیں۔ آپ ہی کی ایک نظر توجہ سے امام فخرالدین رازیؒ کا علم سلب ہو گیا اور پھر آپ سے فیض حاصل کیا۔ (وسیلۂ شرف و ذریعہ دولت ص ۱۶۸ مرتبہ ڈاکٹر طیب ابدالی)

۵۔ سلسلہ فردوسیہ

اس سلسلۂ فردوسیہ کو بعض مصنفین نے حضرت نجم الدین کبریٰ ولی تراشؒ سے منسوب کیا ہے لیکن حقیقت یہ ہے کہ اس سلسلے کی نسبت حضرت خواجہ بدرالدین سمرقندیؒ کے مرید حضرت خواجہ رکن الدین فردوسیؒ[1] سے ہے

[1] حضرت خواجہ رکن الدین فردوسیؒ حضرت شیخ عماد الدینؒ مشائخ وقت کے فرزند ارجمند تھے۔

حضرت خواجہ رکن الدین فردوسیؒ حضرت بدرالدین سمرقندیؒ کے بہت چہیتے شاگرد، مرید اور خلیفہ تھے۔ آپ ہی نے حضرت رکن الدین فردوسیؒ کو فردوسی کا لقب دیا ہے۔ مناقب الاصفیاء میں ایک واقعہ تحریر ہے کہ خواجہ بدرالدین سمرقندیؒ نے سیدالسادات امیر خورد ساکن نوہنشہ کو ایک رات خواب میں دیکھا کہ وہ ایک لڑکے کو آپ کی گود میں دے رہے ہیں۔ سید امیر خورد اپنے وقت کے بڑے جلیل القدر مشائخ میں تھے۔ خواجہ بدرالدین سمرقندیؒ نے صبح کو آپ کی خدمت میں حاضر ہو کر اس خواب کا ذکر کیا۔ سید صاحب نے فرمایا کہ کچھ دنوں بعد اس کی تعبیر تمہارے سامنے آئے گی۔ کچھ ہی دنوں کے بعد سید امیر خورد کی خانقاہ میں شیخ عماد الدین اپنے دو فرزندوں شیخ نظام الدین اور شیخ رکن الدین کے ساتھ پہنچے۔ سید صاحب نے بڑی عزت و احترام کے ساتھ ان لوگوں کی پذیرائی کی اور اپنی لڑکی شیخ عماد الدین کی زوجیت میں دیا۔ بڑے صاحبزادے تو عازم سفر ہوئے۔ چھوٹے صاحبزادے شیخ رکن الدین جو بہت صغیر سن تھے، باپ کے ساتھ رہے۔ ایک روز شیخ عماد الدین اپنے لڑکے کو دیکھ کر آبدیدہ ہوئے تو سید امیر خورد نے رونے کا سبب پوچھا۔ شیخ عماد الدین نے فرمایا کہ مجھے اس خیال پر رقت ہوئی کہ جوان ہو کر یہ لڑکا بھی اپنے بھائی کی طرح مجھ سے دور ہو جائے گا اور اس کی ماں نے مرنے کے وقت وصیت کی تھی کہ اس کو کبھی نظر سے جدا نہ کرنا۔ امیر خورد نے تشفی دیتے ہوئے کہا کہ خاطر جمع رکھو۔ یہ تم سے دور نہیں ہوگا اور اس کی تعلیم و تربیت ایک ایسے شخص کے ذریعہ مقدر ہے جو تم سے بہتر ہے۔ اس کے بعد سید امیر خورد نے خواجہ بدرالدین سمرقندیؒ کو بلا کر فرمایا کہ جس لڑکے کو تم نے خواب میں دیکھا تھا وہ موجود ہے اور میں اسے تمہاری خدمت اور تعلیم و تربیت میں دینا چاہتا ہوں۔ خواجہ بدرالدین سمرقندیؒ اس خبر سے بہت خوش ہوئے اور بڑی خوشی کے ساتھ اپنے گھر پسر معنوی بنانے کے لئے لے گئے اور بڑے اہتمام سے ان کی تعلیم و تربیت کی۔ (وسیلۂ شرف صفحہ ۱۶۹ : مرتبہ ڈاکٹر طیب ابدالی)

سے ہے۔ اس لئے کہ مناقب الاصفیاء مصنفہ حضرت مخدوم شاہ شعیبؒ (عم زادہ حضرت مخدوم جہاںؒ) میں تحریر ہے کہ:

"با آنکہ خواجہ رکن الدین در ہند چناں بر آمد کہ بہ عرب و عجم رسیدہ شجرۂ معظم پیران را بسکہ بنام آوردند پیران فردوس گفتند و پیوستگان ایں شجرہ را در ہند بنام او می خوانند، فردوسی می گویند کہ الالقاب تتنزل من السماء ذلك فضل الله يؤتيه من يشاء۔ (مناقب الاصفیاء ص ۱۲۵)

"خواجہ رکن الدین ہندوستان میں اس شان سے آئے کہ عرب و عجم میں ان کا فیض پہنچا۔ اپنے پیرانِ طریقت کے شجرہ کا سکہ جاری کیا اور وہ مشائخ فردوسی کے نام سے مشہور ہوئے۔ اس شجرہ کے وابستگان ہندوستان میں اپنے سلسلہ کو اسی نام سے پکارتے ہیں اور فردوسی کے نام سے یاد کرتے ہیں۔ پرانا مقولہ ہے کہ نام آسمان سے اترتے ہیں یہ اللہ کا فضل خاص ہے جسے چاہے دے۔

اس سے صاف ظاہر ہوتا ہے کہ آپ ہی سے سلسلہ فردوسیہ کی ابتدا ہوئی ہے۔ اگرچہ تین واسطوں سے اوپر اس سلسلہ کے مشہور بزرگ حضرت نجم الدین کبریٰ ولی تراشؒ ہیں۔ اس سلسلہ کی وسعت و شہرت صوبہ بہار کے جلیل القدر بزرگ حضرت مخدوم جہاں شیخ شرف الدین یحییٰ منیریؒ کی ذات اقدس سے ہوئی جنھوں نے علمی اور روحانی طور پر دین حق کی خدمت کی۔ اور اخوت و محبت کا درس عالم انسانی کو دیا اور خدمت خلق کو اپنا فرض اولین سمجھا۔ آپ کے تصانیف و ملفوظات رہروانِ طریقت و معرفت کے لئے مشعل راہ ہیں۔ سلسلۂ فردوسیہ میں علم طریقت کے ساتھ ساتھ علم شریعت کا حصول بھی فرض سمجھا جاتا ہے۔ زہد و تقویٰ کے ساتھ ساتھ تسلیم و رضا کی بھی تعلیم دی جاتی ہے۔ اخلاص و محبت کے ساتھ ساتھ اخوت و انسانیت کا بھی درس دیا جاتا ہے۔ عاجزی و انکساری اور گم نام پسندی اس راہ کی پہلی منزل ہے۔ تصنیف و تالیف کا اس قدر شغف اور ذوق ہے کہ مخدوم جہاںؒ کے بعد آپ کے تمام جانشینوں نے اپنے پیر و مرشد کی سنت پر عمل کیا۔ حضرت

مولانا مظفر بلخیؒ، حضرت مخدوم حسین نوشہ توحید بلخیؒ، حضرت مخدوم حسن دائم جشن بلخیؒ اور حضرت مخدوم احمد لنگر دریا بلخیؒ اور آپ کے جانشینوں نے خصوصاً خانوادہ بلخیہ نے اس سلسلہ میں بڑی وسعت پیدا کی اور اسے چار چاند لگایا۔ دسویں صدی ہجری میں منیر شریف کے سلسلہ فردوسیہ کے عظیم المرتبت بزرگ حضرت مخدوم شاہ دولتؒ کا فیضانِ فردوسیہ اس قدر مقبول ہوا کہ عہد اکبری و جہانگیری میں سلطنت مغلیہ کے امرا، گورنر وغیرہ حلقہ ارادت میں داخل ہوئے۔ عبدالرحیم خانخاناں، ابراہیم خان کاکڑ صوبہ دار گجرات، راجہ مان سنگھ اسی در سے فیضیاب ہوئے اور اس طرح یہ سلسلہ صوبہ بہار میں بالخصوص بہت ہی مشہور و مقبول رہا۔ سلطان ہند شیر شاہ سوری اسی سلسلہ فردوسیہ کے مشہور بزرگ حضرت مخدوم بڈن فردوسی منیریؒ کا مرید و حلقہ بگوش ہے۔ سلاطینِ ہند بابر سے لے کر شاہ عالم تک اور تمام سلاطین وقت منیر شریف، بہار شریف آ کر ان بزرگوں کے آستانے پر جبینِ عقیدت جھکاتے رہے اور اپنے لئے باعثِ فخر سمجھتے رہے۔ صوبہ بہار کی اکثر و بیشتر خانقاہیں اسی سلسلہ کے فیوض و برکات سے فیضیاب ہیں۔

۶۔ سلسلہ نقشبندیہ یہ سلسلہ حضرت خواجہ بہاء الدین نقشبندؒ [۵] سے منسوب ہے۔ اسی لئے آپ کو سلسلۂ خواجگان نقشبندیہ کا سرتاج

---

۵ آپ کی ولادت باسعادت ۴ محرم الحرام ۷۱۸ھ بمقام قصر عارفاں میں ہوئی۔ جو شہر بخارا سے ایک فرسنگ کے فاصلہ پر واقع ہے۔ حضرت بابا محمد سماسیؒ نے آپ کی ولادت کی بشارت دی تھی۔ آپ کے جد امجد حضرت بابا محمد سماسیؒ کے پاس، ولادت کے تیسرے روز لے گئے۔ حضرت نے آپ کو اپنی فرزندی میں قبول فرمایا اور اپنے خلیفہ سید امیر کلالؒ سے آپ کی تربیت کے بارے میں عہد لیا۔ آپ کو آداب طریقت کی تعلیم بظاہر سید امیر کلالؒ سے ہے مگر حقیقت میں آپ اویسی ہیں کیونکہ آپ کی تربیت حضرت خواجہ عبدالخالق غجدوانیؒ کی روحانیت سے ہوئی ہے حضرت خواجہ کے سیر سلوک کے واقعات متعدد ہیں۔ خود حضرت خواجہ نے فرمایا کہ میں نے سلطان بایزید اور شیخ جنیدؒ اور شیخ شبلیؒ اور شیخ منصور حلاجؒ کے (بقیہ اگلے صفحہ پر)

کہا جاتا ہے۔ اس سلسلے کی نسبت خلیفۃ المسلمین حضرت سیدنا ابوبکر صدیقؓ سے ہے۔ آپ شریعت مطہرہ کی سختی سے پابندی کرتے تھے۔ اسی لیے شریعت پر زیادہ زور رہا ہے اور ظاہری و باطنی ہر طرح پر شریعت کی پابندی لازمی ہے۔ تقویٰ کے ساتھ ساتھ احتیاط کا زیادہ خیال رکھا گیا ہے۔ اسی لئے ان کا نعرہ ہے کہ "نظر بر قدم، خلوت در انجمن"

اس سلسلے میں داخلے سے پہلے ریاضت و مجاہدہ، مراقبہ و ذکر و اشغال کی صبر آزما منزلوں سے گزرنا پڑتا ہے۔ اس سلسلے کی وسعت و شہرت کہ معظمہ، بخارا، مشہد، روسی ترکستان خوارزم، سمرقند میں زیادہ ہوئی۔ ہندوستان میں اس کی ترویج و اشاعت دسویں صدی ہجری کے مشہور بزرگ حضرت خواجہ باقی باللہ سے عہد اکبری میں زیادہ ہوئی۔

(پچھلے صفحہ کا حاشیہ) فرمایا کہ میں نے سلطان بایزید اور شیخ جنیدؒ اور شیخ شبلیؒ اور شیخ منصور حلاجؒ کے مقامات کی سیر کی۔ جہاں وہ پہنچے تھے میں بھی وہاں پہنچا۔ یہاں تک کہ صفات انبیاء کی سیر میں ایسی بارگاہ میں پہنچا کہ جس سے بڑی کوئی بارگاہ نہ تھی۔ میں نے جان لیا کہ یہ بارگاہ محمدی ہے۔ علیہ الصلوٰۃ والسلام۔ حضرت خواجہ سے بہت سے کرامات صادر ہوئے ہیں۔

ایک مرتبہ ملک حسین نے استدعا کی کہ آپ کی خدمت اقدس میں آنا چاہتا ہے۔ آپ سلاطین دارا کی صحبت سے اجتناب کرتے تھے۔ اس لئے مناسب یہی سمجھا کہ اپنی خانقاہ کو ان کی قدم سے محفوظ رکھا جائے۔ اس لئے آپ خود ہرات تشریف لے گئے۔ بادشاہ نے بہت اعزاز و اکرام فرمایا اور آپ سے مسلک نقشبندیہ دریافت کیا تو آپنے فرمایا کہ ہمارے خواجہ عبدالخالق غجدوانیؒ کے خاندان کا قول ہے کہ "خلوت در انجمن" چاہیے۔ بادشاہ نے پوچھا کہ خلوت در انجمن کیا ہے؟ خواجہ نے فرمایا کہ ظاہر میں خلق کے ساتھ اور باطن میں حق کے ساتھ ہونا۔" آپ کی تعلیم میں تقویٰ اور طہارت کے ساتھ مراقبہ اور اذکار و اشغال پابندی کے ساتھ ہیں۔ آپ کی وفات ۳ ربیع الاول ۷۹۱ھ میں ہوئی۔ مزار مبارک قصر عارفاں میں مرجع خلائق ہے۔

(نفحات الانس صفحہ ۲۰۶ تا ۲۰۹)

آپ کے بعد ان کے خلیفہ امام ربانی مجدد الف ثانی حضرت شیخ احمد فاروقی۔ سرہندیؒ نے اس سلسلے کی بڑی خدمت کی۔ اور اس کو مقبول عام بنایا۔ اور پھر یہ سلسلہ مجددیہ نقشبندیہ کے نام سے بھی مشہور ہو گیا۔ گیارہویں صدی ہجری میں امام الہند حضرت شاہ ولی اللہ محدث دہلویؒ نے بھی علمی اعتبار سے اس کو بہت فروغ دیا۔ اور اس کی وسعت ہندوستان کے مختلف مقامات میں اس طرح ہوئی کہ آج بھی صاحب علم اس سلسلہ میں داخل ہو کر اکتساب فیض کرتے ہیں۔

۷۔ سلسلہ زاہدیہ

مختلف سفینوں میں اس سلسلے کا نام سلسلۂ گازرونیہ بھی ہے، اس سلسلے کے امام حضرت ابو اسحاق شہریار گازرونیؒ ہیں

آپ کی ولادت باسعادت ۳۵۳ھ اور وفات ۴۲۶ھ ہے۔ آپ کا نام ابراہیم ہے۔ اصل وطن فارس ہے۔ آپ مرید حضرت خواجہ عبداللہ خفیف شیرازیؒ کے ہیں اور وہ خواجہ رویمؒ کے اور وہ حضرت جنید بغدادیؒ کے ہیں۔ حدیث میں آپ کو مستند اور ثقہ مانا جاتا ہے۔ خانوادہ گازرونیہ آپ ہی سے منسوب ہے اور اب اسے سلسلہ زاہدیہ کہتے ہیں۔ آپ نے ۲۴ حج پیادہ کئے۔ ہر سال ایک ہزار کافر مسلمان اور چالیس مسلمان واصل اور زمین کامل و اکمل بناتے۔ آپ کے مزار مبارک کا لقب تریاق اکبر اس واسطے ہو گیا کہ جو دعا آپ کے وسیلہ سے مانگی گئی، حق تعالے نے قبول فرمایا۔ چونکہ آپ کی دعا تھی کہ خدایا جو کسی حاجت سے میرے پاس آئے اس کی ضرورت پوری فرما۔ اور رحمت سے مہربانی فرما۔ آپ نے مریدوں اور دوستوں کے نام دفتر میں لکھوا کر وصیت کی تھی کہ میری قبر میں رکھ دیں گے۔ بزرگوں نے آپ کو خواب میں دیکھا، پوچھا اللہ تعالیٰ نے کیا معاملہ کیا؟ جواب دیا کہ پہلی بزرگی یہ عطا کی کہ دفتر کے سب آدمیوں کو اللہ تعالے نے بخش دیا۔ اپنے موت کے وقت مریدوں کو چار وصیتیں کیں کہ غور سے سنو اور اس پر عمل کرنا۔ ایک یہ کہ میرے جانشین کی اطاعت کرنا۔ دوسرے ہر صبح قرآن شریف پڑھنا، تیسرے مسافر کو بجز اپنے دوسرے کے مکان میں اُترنے نہ دینا اور مہمان داری کرنا اور چوتھے آپس میں میل سے بسر کرنا۔

(تذکرۃ الاولیاء۔ دعائے گازرونیہ ص۱۴۱)

بعد میں اس کی نسبت حضرت خواجہ شہاب الدین کبیرا مام کعبہ کے صاحبزادے اور جانشین حضرت خواجہ فخر الدین خداداد بزرگ زاہدی رحمۃ اللہ علیہ سے کی جاتی ہے۔ اس سلسلے میں پابندئ شریعت کے ساتھ ساتھ انکساری وسادگی، مہمان نوازی اور فقراء نوازی کی تعلیم دی جاتی ہے۔ بظاہر جمالی شان ہے لیکن باطنی طور پر حدتِ قلب کی وجہ سے جلالی کیفیت طاری رہتی ہے۔ اس سلسلے کو فروغ بغداد، شیراز، سمرقند میں زیادہ ہوا۔ ہندوستان میں اس کا فروغ حضرت خواجہ شہاب الدین حق گو شہید زاہدیؒ سے ہوا ہے۔ اس لیے کہ یہ وہی بزرگ ہیں جنھوں نے سلطان محمد تغلق والئ ہندوستان کے فلسفہ الملک عادل کو تسلیم نہیں کیا۔ اس بات پر ناراض ہو کر سلطان محمد تغلق نے اپنے قلعہ سے گرا کر شہید کر دیا اسی بنا پر حق گو کے نام سے مشہور ہوئے۔ ہندوستان میں میرٹھ، بنگال، یوپی اور بہار میں

لے آپ کا مولد اور خواب گاہ میرٹھ میں ہے۔ اسکندر فیلقوس کے خاندان میں ہیں اور خواجہ قطب الدین بختیار اوشیؒ کے ہم عصر تھے۔ کہتے ہیں کہ ایک سال مال سے بھری ہوئی ایک کشتی دریائے جمنا میں ڈوب گئی۔ جن لوگوں کا مال نقصان ہوا تھا انھوں نے حضرت خواجہ قطب الدین کی خدمت میں عرض کیا۔ خواجہ نے فرمایا کہ دریا کا کنارا برادر فخر الدین کے سپرد ہے۔ لہٰذا آفت زدہ لوگ شیخ کے آستانے پر حاضر ہو کر روئے۔ شیخ نے اس مضمون کا رقعہ لکھ کر دریا میں ڈالا کہ کشتی کو صحیح وسالم کنارے پر پہنچا دے۔ رقعہ نیچے بیٹھ گیا اور کشتی مع مال ومتاع پانی کے اوپر آ گئی۔ کہتے ہیں کہ ایک روز چالیس آدمیوں میں سے ایک آدمی نکل کر آپ کے پاس آیا اس کی پیشانی پر کلمۂ طیبہ کے حروف لکھے ہوئے تھے۔ اس نے کہا کہ آسمانی آفت اس ملک کے واسطے بھیجی گئی ہے۔ لیکن یہ شہر اس زاہد کے ظل حمایت میں ہے لہٰذا خرابی سے محفوظ رہے گا۔ اس بنیاد پر آپ کا سلسلہ زاہدی لفظ کے ساتھ مشہور ہوا۔ سلطان ناصر الدین کے زمانہ میں اس سرائے فانی سے انتقال کیا۔ آپ کی خواب گاہ شریف میرٹھ میں ہے۔

(گلزار ابرار ص ۱۴)

اس سلسلے کی بہت وسعت ہوئی۔ حضرت مخدوم بدرالدین بدرعالم زاہدیؒ چاٹگام سے بہار شریف مخدوم جہاںؒ کی طلبی پر آئے۔ آپکے چہرے پر جلال و جمال کی ایسی کیفیتیں مرتسم رہتیں کہ کوئی شخص متاثر ہوئے بغیر نہیں رہتا۔ ان کے خلفا اور اخلاف نے اس سلسلے کو بہت زیادہ فروغ دیا۔ رشد و ہدایت کا یہ سلسلہ یو پی اور صوبہ بہار کے شمالی حصہ میں اتنا مقبول عام ہے کہ بلا فرق مذہب و ملت آج بھی اس سلسلے کے بزرگوں کے آستانے فیض عام کے لئے مرجع خلائق ہیں۔

۸۔ سلسلہ ابوالعلائیہ یہ سلسلہ حضرت سیدنا امیر ابوالعلیٰ اکبرآبادی[ل] سے منسوب ہے اصل میں یہ سلسلہ نقشبندیہ کی شاخ ہے۔ اس لئے کہ

[ل] آپ کی ولادت باسعادت نزیلہ میں سنہ ۹۹۰ھ میں ہوئی اور آپ کی وفات ۹ صفر سنہ ۱۰۶۱ھ میں ہوئی۔ مزار فیض آثار آگرہ میں مرجع خاص و عام ہے۔ آپ کا اسم شریف امیر ابوالعلیٰ ہے۔ آپ کے نانا جان خواجہ محمد فیض بردوان میں ناظم کے عہدے پر فائز تھے۔ وہ ایک مہم میں شہید ہوگئے۔ چونکہ خواجہ فیض کا کوئی لڑکا نہیں تھا اس لئے راجہ مان سنگھ نے آپ کی لیاقت و قابلیت دیکھ کر آپ کے نانا کے عہدے پر آپ کا تقرر کر کے بادشاہ سے پروانہ تقرری حاصل کرلیا اور عہد نظامت پر متمکن ہو کر منصب سہ ہزاری ذات و سوار سے ممتاز ہوئے۔ آپنے متعدد جنگوں میں شرکت کی ہے اور امیر لشکر ہو کر کامیاب ہوئے ہیں۔ شہنشاہ اکبر کے انتقال کے بعد جہانگیر نے تخت پر بیٹھتے ہی یہ فرمان جاری کیا کہ سب امرار و ناظم دربار میں حاضر ہوں تاکہ ان کی قابلیت کا اندازہ ہو سکے۔ آپنے اس شاہی فرمان کو تائید غیبی سمجھا۔ اور بردوان سے آگرہ روانہ ہوگئے۔ راستے میں منیر شریف پڑتا تھا۔ وہاں حضرت شیخ شرف الدین احمد یحییٰ منیریؒ کی اولاد میں ایک مشہور بزرگ حضرت مخدوم شاہ دولت منیریؒ تھے۔ ان کے یہاں آپنے کچھ دن قیام کیا اور آپکے فیضان خاص سے سرفراز ہوئے۔

تذکروں میں ہے کہ جب مخدوم دولتؒ نے سیدنا امیر ابوالعلیٰ کو دیکھا تو فرمایا آؤ! شاہ اعلیٰ آؤ! مرحبا جزاک اللہ! یہ تم نے خوب کیا کہ دنیا کو چھوڑ دیا۔ خود سیدنا امیر ابوالعلیٰ کا بیان ہے کہ حضرت مخدوم شاہ دولت منیریؒ نے (بقیہ اگلے صفحہ پر)

آپ کے چچا حضرت امیر سید عبداللہ اکبرآبادیؒ سلسلہ نقشبندیہ کے بزرگ ہیں۔ عبداللہ عن حضرت خواجہ محمد یحییٰ عن حضرت خواجہ عبدالحق المبشر محی الدین عن خواجہ ناصرالدین عبیداللہ احرار عن حضرت خواجہ مولینا یعقوب چرخی عن حضرت خواجہ بہاء الدین نقشبند۔

حضرت سیدنا ابوالعلیٰ دسویں صدی ہجری کے مشہور بزرگ ہیں جو عہد اکبری میں عہدۂ نظامت پر متمکن تھے اور منصب سہ ہزاری سے ممتاز ہوئے۔ عہد جہانگیری میں آپ نے اس منصب کو چھوڑ دیا اور مسند فقر و قناعت پر متمکن ہوئے۔ آپ آگرہ جاتے ہوئے منیر شریف میں حضرت مخدوم شاہ دولت منیریؒ سے ملاقات کی اور فیوض

(پچھلے صفحہ کا حاشیہ) اپنے دست مبارک سے تین لقمے میرے منہ میں ڈالے۔ اس سے میرا قلب روشن ہوگیا اور حجابات کے پردے اٹھ گئے۔ منیر سے آگرہ روانہ ہوگئے۔ لیکن دل کی کیفیت دوسری تھی۔ جب آپ جہانگیر کے پاس پہنچے تو غایت محبت میں شہنشاہ جہانگیر نے اپنے ہاتھ سے شراب کا ایک جام آپ کو دیا۔ آپ نے انکار کیا۔ پھر جام بڑھایا تو آپ نے انکار کیا وہ سخت برہم ہوا اور اس نے طیش میں آکر کہا کیا تم غضب سلطانی سے نہیں ڈرتے۔ آپ نے جواب دیا۔ غضب سلطانی سے نہیں ڈرتا، قہر ربانی سے ڈرتا ہوں۔ آپ نے ایک نعرہ اللہ کا لگایا اور دربار سے چلے آئے اور اپنے عہدے سے سبکدوش ہوئے اور درویشانہ زندگی اختیار کیا۔ اجمیر شریف خواجہ غریب نوازؒ کے آستانے پر پہنچے وہاں سے بھی فیوض روحانی حاصل ہوئے۔ آپ اپنے چچا امیر عبداللہؒ سے بیعت ہوئے۔ آپ کے پیر و مرشد نے خرقۂ خلافت سے سرفراز فرمایا۔ آپ بڑے صاحب نسبت بزرگ تھے۔ ریاضت و مجاہدہ، قناعت و توکل میں یگانہ روزگار تھے۔ سخاوت اور عطا و بخشش کے لئے مشہور تھے۔ آپ کی علمی یادگار رسالہ فنا و بقا ہے۔ آپ کا قول ہے کہ: "صوفی وہ نہیں ہے جو چلہ کشی کرے خلوت میں بیٹھ کر ریاضت و مشقت اختیار کرے۔ بلکہ صوفی وہ ہے کہ خود باقی نہ رہے۔"

(خم خانۂ تصوف ص ۴۲ تا ص ۴۳

مرتبہ: ڈاکٹر ظہورالحسن شارب)

روحانی سے مالا مال ہوئے۔ اس سلسلہ میں عطا و بخشش اور سخاوت کی خاص طور پر تعلیم دی جاتی ہے۔ ظاہری وجاہت اور شان و شکوہ کے پردے میں فقیری پوشیدہ ہے۔ وجد و سماع کا بھی خاص شغف ہے۔ سلسلہ ابوالعلائیہ کو ہندوستان میں کافی فروغ ہوا۔ مدھیہ پردیش، گجرات اور یوپی میں اس کی بڑی وسعت ہوئی۔ لیکن صوبہ بہار میں اس سلسلے کے عظیم المرتبت مشہور بزرگ حضرت مخدوم منعم پاک باز گیارہویں صدی ہجری کے ہیں۔ ان کے فیوض سے اس کی بڑی مقبولیت ہوئی۔ آپ کے بعد آپ کے خلفا میں حضرت غلام حسین منعمیؒ، مخدوم حسن علیؒ، حضرت رکن الدین عشقؒ، حضرت مولانا حسن رضا اور حضرت صوفی دائم شاہ اور ان کے خلفاء نے اس سلسلے کو اور فروغ دیا اور ہر خانقاہ میں اس کے فیوض جاری و ساری ہوئے۔

حضرت منعم پاک بازؒ عن حضرت میر سید اسداللہؒ عن مولانا شاہ محمد فرہاد ابوالعلائیؒ عن حضرت سید محمد دوست محمد ابوالعلائیؒ عن حضرت سیدنا میر ابوالعلیٰ اکبر آبادیؒ۔

۹۔ سلسلہ شطاریہ

یہ سلسلہ حضرت شیخ عبداللہ شطارؒ بن حسام الدین النوری البخاریؒ[۱] سے منسوب ہے۔ آپ حضرت شیخ الشیوخ شہاب الدین

---

[۱] آپ کی وفات ۸۹۰ھ میں ہوئی اور مانڈو میں سلاطین خلجی کے مقبرے سے جنوبی سمت میں مدفون ہیں۔ آپ کا نام عبداللہ اور لقب حضرت اعلیٰ ہے۔ آپ حضرت شیخ الشیوخ شہاب الدین سہروردیؒ کی اولاد میں ہیں۔ آپ کا وطن مالوف بخارا تھا۔ آپ شیخ محمد عارف کے خلیفہ ہیں جن کو شیخ محمد عاشقؒ سے خلافت تھی۔ ان کو اپنے والد سے شیخ خدا قلی ماوراء النہری سے۔ ان کو شیخ ابوالحسن عشقی سے، ان کو ابو مظفر ترک سے، ان کو شیخ ابو یزید اعرابی سے، ان کو شیخ محمد مغربی سے، ان کو سلطان العارفین شیخ ابو یزید بسطامیؒ سے اجازت و خلافت تھی اسی سبب سے اس سلسلے کو ایران اور توران میں عشقیہ اور دار الملک روم میں بسطامیہ کہتے ہیں۔ آپ نے بخارا، خراسان اور عراق کی بھی سیاحت کی ہے۔ آذربائجان میں حضرت سید علی موحدؒ کی خدمت اختیار کی۔ وہ فرماتے ہیں کہ سید علی موحدؒ کو (بقیہ اگلے صفحہ پر)

سہروردیؒ کی اولاد میں سے ہیں اور سلسلۂ ارادت کا تعلق حضرت خواجہ بایزید بسطامیؒ سے ہے

(پچھلے صفحہ کا حاشیہ) شریعتؒ طریقت اور حقیقت میں زیور کمالات سے آراستہ پایا اور ان کی صحبت سے مجھ کو فائدہ پہنچا۔ سید علی موحدؒ کو شیخ زین الدین خوافیؒ سے اجازت تھی جو چار واسطوں سے شیخ الشیوخ شہاب الدین سہروردیؒ تک پہنچتے ہیں۔ آپ نے تصوف میں ایک رسالہ لطائف غیبیہ لکھا ہے۔ جس کو سلطان غیاث الدین خلجی مالوہ کے نام سے منسوب کیا ہے۔

حضرت شاہ عبداللہ شطارؒ کے جسم پر شاہانہ باس ہوتا اور ہمراہی صوفیوں کے جسم پر فوجی وردیاں ہوتی تھیں۔ شان کے ساتھ علم اٹھاتے ہوئے اور نقارہ بجاتے ہوئے اسی طمطراق کے ساتھ سیاحی کرتے تھے اور اہل جہاں کا تماشا کر کے فیض پہنچاتے تھے۔ اثنائے سفر میں جس زمین اور مقام پر پہنچتے تھے اس سرزمین کے مشائخ کو پیغام بھیجتے تھے کہ ایک درویش نے اس خیال سے سیاحی کی ہے اگر کلمہ توحید کا معنی کوئی شخص اس سے بہتر جانتا ہو تو وہ مسافر کو تعلیم کردے اور اگر ایسا نہیں کر سکتے تو مقیم لوگوں کا بے مشقت فائدہ اس میں ہے کہ وہ گنج توحید مسافر سے حاصل کرلیں۔ کیونکہ ایسی نعمت جس میں اسباب سعادت بھی بہم پہنچیں مشکل سے ہاتھ آتی ہے۔ مختصر یہ کہ جب آپ بنگالہ پہنچے تو حسب معمول یہی پیغام شیخ محمد علا قاضن شطاری کے پاس بھی بھیجا لیکن آپ نے کوئی توجہ نہ دی۔ انہیں ایام میں سلطان غیاث الدین خلجی نے چتوڑ کے قلعہ کا محاصرہ کر رکھا تھا۔ آپ جب بنگالہ سے واپس ہوئے تو اسی راہ سے آکر قلعہ محصور سے نیچے آٹھہرے۔ سلطان موصوف نے حاضر ہو کر قدم بوسی کی سعادت حاصل کی۔ پھر آپ کی توجہ اور دعا کی بدولت تھوڑے ہی دنوں کے اندر قلعہ فتح ہوگیا کہ جس کے بارے میں گمان بھی نہیں کیا جا سکتا تھا۔ سلطان نے نہایت تعظیم و تکریم کے ساتھ آپ کو اپنی روانگی سے پہلے دارالسلام مانڈو روانہ کیا۔ جہاں رشد و ہدایت کا سلسلہ قائم رہا اور سلسلہ شطاریہ کی اشاعت و ترویج ہوئی۔ حضرت قاضن علا شطاری یہیں خرقہ خلافت سے نوازے گئے

(وسیلۂ شرف و ذریعۂ دولت ص ۲۰)

اسی سبب سے اس سلسلہ کو ایران و توران میں عشقیہ اور دارالملک روم میں بسطامیہ کہتے ہیں۔ آپ حضرت شیخ محمد بن عارف فاریابی العشقیؒ سے مرید ہیں۔ حضرت عبداللہ شطارؒ شاہانہ لباس زیب تن کرتے اور تزک و احتشام کے ساتھ سفر کرتے تھے۔ نویں صدی ہجری کے آپ مشہور بزرگ ہیں۔ آپ ہی سے حضرت ابو الفیض قاضن علا شطاریؒ نے خرقۂ خلافت پہنا اور پھر آپ کے ذریعہ اس سلسلے کی ترویج و اشاعت کثرت سے ہوئی۔ شمالی بہار میں آپ کے صاحبزادے حضرت ابو الفتح ہدیۃ اللہ پیر سرمستؒ اور ان کے مرید و خلیفہ شیخ ظہور حاجی حمید الدین حضورؒ سے اس سلسلے کی وسعت ہوئی۔ پھر حضرت ظہور کے مرید با مراد ہندوستان کے مشہور بزرگ حضرت سید محمد غوث گوالیاری شطاریؒ کی ذات اقدس سے ہمہ گیر سطح پر اس سلسلے کی وسعت ہوئی۔ حضرت غوث گوالیاری کے بڑے بھائی حضرت شیخ پھول ہیں، ان کا شہنشاہ جہانگیر بہت معتقد تھا۔ اس لئے ہندوستان کے مختلف مقامات میں خصوصیت کے ساتھ آگرہ، مہاراشٹر، گجرات، مدھیہ پردیش، یوپی اور بہار میں اس کی وسعت و شہرت بہت زیادہ ہے اور عہد جہانگیری میں اس سلسلے کا بہت فروغ ہوا۔ شیخ وجیہ الدین علوی گجراتیؒ نے بھی اس کو کافی ترقی دی۔ ذکر و اشغال اور مراقبے کی تعلیم اس میں اس طور پر دی جاتی ہے کہ جلد منازل سلوک طے ہو جاتے ہیں۔

۱۰۔ سلسلۂ مداریہ: یہ سلسلہ حضرت شیخ بدیع الدین مدارؒ ہرزیؒ سے منسوب ہے۔[۱] حضرت موصوف کی عمر شریف تقریباً ۳۹۶ برس کی تھی۔

---

[۱] آپ کی ولادت باسعادت پہلی شوال ۲۴۲ھ کو ہوئی اور وصال ۱۷ جمادی الاول ۸۳۸ھ کو ہے۔ مزار پُر انوار مکن پور میں واقع ہے۔ آپ کا نام بدیع الدین اور لقب قطب مدار ہے۔ آپ علم شریعت و طریقت سے مالا مال ہوئے اور علم سیمیا، علم کیمیا اور علم ریمیا میں بھی دستگاہ حاصل کی۔ تحصیل علوم ظاہری کے بعد علم باطنی کی طرف متوجہ ہوئے آپ حضرت طیفور شامیؒ سے مرید ہوئے۔ پیر و مرشد نے اس روحانی تعلیم کے بعد خرقۂ خلافت سے سرفراز فرمایا۔ کچھ دنوں کے بعد زیارت حرمین کے لئے تشریف لے گئے۔ (بقیہ اگلے صفحہ پر)

جس کی وجہ سے یہ سلسلہ بہت کم واسطوں سے آں حضرت صلی اللہ علیہ وسلم تک پہنچتا ہے۔

(پچھلے صفحہ کا حاشیہ) فریضۂ حج کی ادائیگی کے بعد مدینہ منورہ حاضر ہوئے۔ دربار رسالت میں باطنی نعمتوں سے نوازے گئے۔ دربار رسالت سے فرمان ہوا کہ ہندوستان جاؤ۔ ہندوستان آکر گجرات میں کچھ عرصہ قیام فرمایا۔ پھر آپ ہندوستان کے مختلف شہروں کا دورہ کرکے مکہ معظمہ تشریف لے گئے۔ حج کیا اور مدینہ منورہ حاضر ہوئے۔ وہاں سے کاظمین، بغداد، نجف اشرف ہوتے ہوئے پھر ہندوستان تشریف لائے۔ بغداد میں حضرت غوث الاعظم سیدنا عبدالقادر جیلانی رح سے ملاقات کی۔ اس سفر میں ہندوستان کی سیر کرتے ہوئے اجمیر شریف پہنچے اور وہاں حضرت خواجہ معین الدین چشتی رح سے ملاقات کی۔ پھر حرمین شریف کی زیارت کا شوق دامن گیر ہوا۔ آپ حج سے فارغ ہو کر نجف اشرف گئے۔ وہاں سے آپ وطن حلب آئے اور حلب سے چنادہ وہاں سے کچھ دن قیام فرمانے کے بعد پھر مدینہ منورہ تشریف لائے وہاں آپ کو حکم ملا کہ ہندوستان جاؤ۔ حکم پاکر ہندوستان روانہ ہوئے۔ ممالک عرب، عجم، خراسان کی سیر و سیاحت فرماتے ہوئے اجمیر آئے اور اجمیر سے کالپی چلے گئے۔ کالپی سے جون پور ہوتے ہوئے مکن پور پہنچے۔ وہاں سے کنتور گئے، پھر گھاٹم پور ہوتے ہوئے سورت میں رونق افروز ہوئے۔ پھر زیارت حرمین شریف کے عشق نے آپ کو بے قرار کیا۔ حج سے فارغ ہو کر مدینہ منورہ حاضر ہوئے اور دربار نبوی کی عنایت سے سرفراز ہوئے۔ ہندوستان تشریف لائے اور مکن پور میں مستقل سکونت اختیار کی۔ آپ حبس دم بہت فرماتے تھے۔ آپ کی عمر بہت ہوئی۔ آپ کھانے پینے کی خواہش سے مدتوں بے نیاز رہتے تھے۔ آپ سرور عالم صلے اللہ علیہ وسلم کی روحانیت سے فیض یافتہ تھے۔ آپ اویسی تھے۔ آپ سے کشف و کرامات بھی بہت صادر ہوئے۔ حضرت شیخ حسین نوشہ توحید بلخی رح نے نصف کتاب عوارف المعارف مصنفہ شہاب الدین سہروردی مخدوم جہاں سے پڑھی تھی اور نصف کے متعلق آپ نے فرمایا تھا کہ حضرت شیخ بدیع الدین مدارؒ سے پڑھو گے۔ حضرت مخدوم جہاںؒ کے وصال کے بعد شاہ مدار جون پور تشریف لائے تو (بقیہ اگلے صفحہ پر)

آپ کے پیرو مرشد حضرت شیخ طیفور شامیؒ ہیں اور ان کے پیرو مرشد حضرت شیخ امین الدین شامیؒ ہیں اور ان کے پیرو مرشد حضرت شیخ عبداللہ علمبردارؓ کی ہیں اور ان کے پیرو مرشد حضرت امیرالمومنین سیدنا ابوبکر صدیق رضؓ ہیں۔ آپ نے دور دراز ملکوں کا سفر کیا اور برابر سفر ہی میں رہے اور یہی سلسلے کی شہرت کا ضامن ہوا۔ کاظمین، بغداد، نجف اشرف ہوتے ہوئے ہندوستان تشریف لائے اور ہندوستان میں گجرات، اجمیر آئے اور اجمیر سے کالپی، جون پور ہوتے ہوئے کان پور پہنچے اور مکن پور میں مستقل سکونت اختیار کی۔ آپ سے سلسلہ مداریہ کو، آپ کی زندگی ہی میں فروغ حاصل ہوا اس سلسلے کی تعلیم یہ ہے کہ اول اپنے آپ کو پہچان لو تو خدا کو پہچان لوگے۔ خود حضرت بدیع الدین مدار فرماتے ہیں کہ :۔

"تم کو یہ خیال کرنا چاہیے کہ تم کون ہو، کہاں سے آئے ہو، کہاں جانا ہے۔ اس عالم میں کس لئے آئے تھے اور خداوند تعالیٰ نے تم کو کس لیے پیدا کیا تھا۔ نیک بختی اور بدبختی کیلیے اول تم کو ان چیزوں سے آگاہ ہونا چاہیے اور تمہاری صفات بعض حیوانی ہیں بعض شیطانی بعض ملکی۔"

"تم کو یہ معلوم ہونا چاہیئے کہ تمہاری اصل صفات کون ہیں۔

(پچھلے صفحہ کا حاشیہ) شیخ حسین بلخیؒ بہار شریف سے ان کی خدمت میں پہنچے۔ حضرت شیخ مدار کا طریقہ یہ تھا کہ ان کے روئے مبارک پر برقع کا حجاب رہتا تھا چنانچہ تمام حجابات کو اُٹھا دیا اور آپ نے فرمایا کہ "اے سمندر توحید خوب آئے ہیں زمانہ سے تمہارا منتظر تھا۔" شیخ حسین قدم بوس ہوئے۔ حضرت شاہ مدار کی یہ گھڑی خوشی کی ہوئی اور ان کو گلے سے لگایا اور نوازشیں کیں اور حضرت مخدوم جہاںؒ کی وصیت کے مطابق بقیہ نصف عوارف المعارف کو حضرت شاہ مدار سے پڑھ کر تمام فیوض سے فیضیاب ہوئے۔

(وسیلۂ شرف و ذریعۂ دولت ص۱۰۶)

یاد رکھو! کھانا پینا، سونا، فربہ ہونا، غصہ کرنا، یہ حیوانی صفات ہیں۔ مکر و فریب کرنا، فتنہ برپا کرنا یہ شیطانی صفات ہیں۔ اگر ان صفات کے تم تابع ہو گے تو حق تعالیٰ کی معرفت تم کو حاصل نہیں ہو سکتی۔ ہاں! اگر صفات ملکوتی تم حاصل کر لو گے تو کیا عجب کہ معرفت خداوندی سے تمہارا قلب روشن ہو جائے۔ تم کو کوشش کرنی چاہئے کہ صفات حیوانی و شیطانی سے نکل کر صفات ملکوتی حاصل کرو۔"

"دیکھو! اللہ تعالیٰ نے تم کو دو چیزوں سے بنایا ہے ایک بدن اور دوسری روح۔ روح کی دو قسمیں ہیں۔ حیوانی اور انسانی۔ روح حیوانی تمام جانوروں کو عنایت ہوتی ہے۔ اور روح انسانی انسان کے ساتھ خاص ہے۔ جب تک روح انسانی سے کام نہ لو گے انسان نہیں ہو سکتے اور نہ معرفت خداوندی حاصل ہو سکتی ہے۔"[1]

ہندوستان میں آپ کے خلفاء سید ابو الحسن طیفورؒ، سید اجمل جون پوریؒ اور حضرت قاضی شہاب الدینؒ پرکالۂ آتش سے اس سلسلے کو فروغ ہوا۔ صوبہ بہار میں آپ کے خلفاء میں حضرت جمال الدین جان من جنتیؒ ہیں۔ ان کا مزار اقدس ہلسہ ضلع نالندہ میں ہے اور اس سلسلے کے بزرگ حضرت لودی شاہ دیوانؒ اسلام پور ضلع نالندہ میں قابل ذکر ہیں۔ اور حضرت دیوان شاہ ارزانؒ پٹنہ، سلسلہ مداریہ کے مشہور بزرگ ہیں۔ آپ نے حضرت فضل اللہ بدخشانیؒ سے فرمایا کہ:

"اے عزیز! تم نے اس کوچہ میں قدم رکھا ہے، جو ایک دریائے ناپیدا کنار ہے۔ جس میں بلا اندر بلا ہے جو لوگ ہوشیار رہتے ہیں

---

[1] خم خانۂ تصوف ص ۲۶۶ مرتبہ: ڈاکٹر ظہور الحسن شارب

وہ جرأت و ہمت کو اپنا شعار کر کے پار ہو جاتے ہیں اور حیات ابدی
حاصل کرتے ہیں۔ اس میں راحت و آرام کو خیرباد کہنا ہوتا ہے اور
جیتے جی مصیبت میں مبتلا ہونا ہوتا ہے۔"

۱۱۔ سلسلہ قلندریہ یہ سلسلہ حضرت نجم الدین مبارک غوث الدہر قلندر غزنوی رحمۃ اللہ علیہ[1] سے منسوب ہے۔ اس سلسلے کی سب سے بڑی خوبی یہ ہے کہ صرف دو ہی واسطے کے بعد آقائے نامدار سید المرسلین حضرت محمد مصطفےٰ صلے اللہ علیہ وسلم کی نسبت آتی ہے۔ حضرت شیخ نجم الدین قلندر غزنوی کے پیر و مرشد حضرت میر سید خضر رومی تھے اور آپ کے پیر و مرشد حضرت شیخ عبدالعزیز علیہ الرحمہ دار حضرت محمد مصطفےٰ صلے اللہ علیہ وسلم ہیں اور آپ حضرت رسول اکرم صلی اللہ علیہ وسلم کی غلامی میں تھے۔ اس سلسلے میں شریعت و طریقت کی پابندی کے ساتھ ساتھ حقیقت کی بھی تعلیم دی جاتی ہے۔ حجابات کے پردے چاک ہو جاتے ہیں۔ ذکر و اشغال اور مراقبے سے سلوک کی منزلیں طے کی جاتی ہیں۔ اسی سلسلے کی وسعت و شہرت یوپی میں حضرت شیخ نجم الدین غوث الدہر قلندرؒ کے مرید و مجاز

---

[1] آپ سادات حسینی میں سے ہیں۔ آپ کا سلسلہ نسب حضرت زید شہید ابن حضرت امام زین العابدین رضی اللہ عنہما تک پہنچتا ہے۔ آپ کا سن شریف تقریباً دو سو برس کا تھا۔ اس لئے آپ کو سیر سلوک کا کافی موقع ملا ہے۔ اور آپ کا سلسلہ بھی صرف تین واسطوں سے خاتم النبیین احمد مجتبیٰ محمد مصطفےٰ صلے اللہ علیہ وسلم پہنچتا ہے۔ آپ حضرت امیر سید خضر رومیؒ کی خدمت میں پہنچے۔ ریاضت و مجاہدہ کیا اور آپ کے دست حق پرست پر بیعت ہوئے۔ آپ غار حرا میں کئی برسوں تک مشغول بحق رہے ہیں۔ چنانچہ حضرت حسین نوشہ توحید بلخیؒ نے قطب الدین بینائے دل کی تعلیم کرنے کے بعد فرمایا کہ اب تمہار اکشود کار حضرت نجم الدین غوث الدہر قلندرؒ کی توجہ پر منحصر ہے۔ جو غار حرا میں مشغول بحق ہیں۔ آپ کا وصال ۳ ذی الحجہ روز چہار شنبہ ۸۰۰ھ ہے۔ صوبہ مالوہ میں آپ کی قبر سلطان غوری کے محل کے پاس ہے۔
(اصل المقصود مصنفہ شاہ تراب علی قلندر ص ۴۱-۵۸ مخطوطہ خدا بخش اورینٹل لائبریری پٹنہ)

حضرت قطب الدین بینائے دل جون پوری سے بہت ہوئی۔ گیارہویں صدی ہجری کے ایک جلیل القدر بزرگ حضرت دیوان محمد رشید جون پوری کو حضرت قطب الدین بینائے دل جونپوری کے پرپوتے حضرت عبد القدوس قلندر سے اس سلسلے کا فیض نہ صرف یوپی ہی میں محدود رہا۔ بلکہ صوبہ بہار میں بھی مختلف خانوادے میں پہنچا۔ اس سلسلے میں تقویٰ و طہارت کے علاوہ اذکار و اشغال کی ایسی تعلیم دی جاتی ہے اور اس میں ایسی کشش ہے کہ تمام خانوادے اسے فیض حاصل کرنا اپنے لئے حصول برکت اور تقرب الٰہی کا ذریعہ سمجھتے ہیں۔ حضرت میر فضل اللہ گوسائیں بارہ دری بہار شریف، اس سلسلے کے بافیض بزرگ ہیں۔ ہمارے خاندان میں اسی سلسلے کے ایک گراں قدر بزرگ حضرت حافظ بختیار رنا مدار مصری کے واسطے سے اس سلسلے کا فیض پہنچا اور حضرت صوفی منیری کے ماموں حضرت اعظم علی عرف بھکن منیری ان کے خلیفہ و مجاز ہوئے۔

۱۲۔ سلسلہ خلوتیہ

یہ سلسلہ حضرت شیخ محمد خلوتی رحمۃ اللہ علیہ سے منسوب ہے۔ جن کو نجم الدین کبریٰ ولی تراش سے فیض پہنچا ہے۔ اور حضرت نجم الدین کبریٰ ولی تراش کو حضرت عمار یاسر بدلیسی سے فیض پہنچا۔ آپ کی خانقاہ میں بارہ برس تک طریقت و حقیقت حاصل کی ہے۔ اور اس سلسلے کی وسعت اور شہرت حضرت شیخ منظر کتکانی بیناپوری سے بہت زیادہ ہوئی۔ لیکن یہ سلسلہ مخصوص حلقے میں محدود ہو کر رہ گیا۔

۱۳۔ سلسلہ اویسیہ

حضرت امام العشاق خواجہ اویس قرنی سے منسوب ہے۔ اس سلسلے کی نسبت بڑی تیز ہوتی ہے۔ حالانکہ اس سلسلے میں حضرت خواجہ

لہ آپ کی وفات ۳ رجب المرجب ۳۲ھ میں ہوئی۔ اور دوسرے قول کی بنا پر ۳ رجب المرجب ۳۷ھ کو ہوئی۔ آپ کا اسم گرامی اویس ہے۔ آپ اہل نجد کے قبیلہ قرن سے تعلق رکھتے ہیں۔ آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم نے آپ کی تعریف فرمائی ہے۔ آپ آں حضرت کے عہد مبارک میں موجود تھے۔ دو اسباب کی بنا پر صحبت مبارک حاصل نہیں ہو سکی۔ ایک تو ضعیف ماں کی خدمت اور ہمہ وقت حاضری کی وجہ سے اور دوسرے کمال غلبہ حال کے باعث شتربانی آپ کا (بقیہ اگلے صفحہ پر)

دلو اسحٰق شہریار دگار زرد نی ؒ، عبداللہ حنیف شیرازیؒ اور حضرت سید جلال الدین حسین مخدوم جہانیاںؒ قابل ذکر ہیں۔ یہ اویسی نسبت ایک خاص اہمیت کی حامل ہے۔ یہ سلسلہ عرب و عجم میں تو پھیلا ہی ہندوستان بہ خصوصیت کے ساتھ ہر خانقاہ میں اس کی عظمت اہمیت ہے۔ اس سلسلے میں والہانہ کیفیت کی تعلیم دی جاتی ہے اور عاشقانہ رنگ رہتا ہے۔

(بقیہ پچھلے صفحہ کا) محبوب مشغلہ تھا۔ اس سے جو کچھ حاصل ہوتا۔ ماں کی خدمت اور اپنی مایحتاج میں صرف کرتے تھے۔

آپ کو آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم سے حد درجہ عشق تھا۔ جب معلوم ہوا کہ جنگ اُحد میں آں حضرت کے کچھ دندان مبارک شہید ہو گئے ہیں اور یہ نہ معلوم ہو سکا کہ کتنے اور کون سے ہیں۔ آپ نے اپنے تمام دانتوں کو توڑ ڈالا۔ آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم نے یہ وصیت فرمائی تھی کہ میرا خرقہ اویس قرنی کو پہنچا دیا جائے۔ اور ان سے میری طرف سے کہہ دو کہ میری اُمت کے حق میں دعائے خیر فرمائیں۔ حضرت عمرؓ اپنے عہد خلافت میں حضرت علی کرم اللہ وجہہ کے ساتھ تشریف لے گئے۔ حضرت اویس قرنیؓ کی خدمت میں حاضر ہوئے۔ آں حضرت کا خرقہ مبارک حضرت اویس قرنیؒ کو دیا۔ اور امت کے حق میں دعا کے لئے کہا۔ اللہ تعالیٰ نے آپ کی دعا سے قبیلہ ربیعہ اور مضر کی بکریوں کے بالوں کی تعداد سے زیادہ اُمت محمدی کو بخشا۔

شواہد النبوت میں آپ کی وفات کے بابت تحریر ہے کہ آذر بائجان میں غرار گئے ہوئے تھے۔ وہاں آپ کا وصال ہو گیا۔ لوگوں نے آپ کی قبر کھودنا چاہی ایک پتھر کی چٹان ملی۔ جہاں ان کی قبر لحد پہلے سے تیار تھی۔ پھر کفن کا ارادہ کیا وہاں ایسے کپڑے ملے جو انسان کے بنے ہوئے نہ تھے۔ ان کپڑوں سے آپ کا کفن تیار کیا اور کفنا کر اس لحد میں دفن کر دیا گیا۔ کشف المحجوب اور تذکرۃ الاولیاء میں تحریر ہے کہ حضرت اویس قرنیؓ، حضرت علیؓ کے پاس آئے اور ان کی کوفت میں جنگ صفین میں لڑے اور شہید ہوئے۔

(سفینۃ الاولیاء ص ۴ مصنف دارا شکوہ)

۱۴۔ سلسلہ مغربیہ

یہ سلسلہ حضرت شیخ الکبیر شعیب المغربی[۱] رحمۃ اللہ علیہ سے منسوب ہے۔ آپ حضرت محی الدین ابن عربی کے پیرو مرشد ہیں اور شیخ ابو یعزا حضرت مسعودؒ کے مرید و خلیفہ ہیں۔ دیار مغرب کے مشائخ کبار اور صاحب کشف و کرامات بزرگ گزرے ہیں۔ حضرت شیخ احمد غزالیؒ اس سلسلہ کے مشہور بزرگ ہیں اور حضرت شیخ الکبیر کے پیران پیر میں سے ہیں۔

اس سلسلے کے مشہور بزرگ حضرت احمد گنج کبیر گنج بخش ہیں۔ جن سے اس سلسلے کو کافی فروغ ہوا۔

۱۵۔ سلسلہ طیفوریہ

یہ سلسلہ حضرت شیخ طیفور بسطامی[۲] رحمۃ اللہ علیہ سے منسوب ہے۔ آپ بایزید بسطامیؒ کے نام سے بھی مشہور ہیں۔ آپ کے پیرو مرشد

---

[۱] آپ کی وفات سنہ ۵۹۰ھ میں ہوئی۔ آپ کا نام شعیب بن الجیرہ اور لقب ابومدین اور نسبت مغربی ہے۔ آپ حضرت شیخ ابویعزا مغربیؒ کے مرید اور شیخ محی الدین ابن عربیؒ کے پیرو مرشد ہیں۔ زمین مغرب کے مشائخ کبار اور صاحب کشف و کرامات بزرگ ہیں۔ ایک دن شیخ ابومدین نے دیار مغرب کے کسی مقام پر اپنی گردن کو جھکا کر کہا اللھم انی اشھد ملائکتک انی سمعت واطعت۔ آپ کے اصحاب نے اس کا سبب دریافت کیا۔ فرمایا کہ شیخ عبدالقادر جیلانی قدس سرہٗ نے بغداد میں یہ فرمایا قدمی ھذہ علیٰ رقبۃ کل ولی اللہ اس کے بعد بغداد کے بعض اکابر حاضر خدمت ہوئے۔ اور انہوں نے اطلاع دی کہ حضرت عبدالقادر جیلانی نے اسی وقت یہ الفاظ فرمائے تھے۔

(سفینۃ الاولیاء صفحہ ۹۵، نفحات الانس صفحہ ۲۹)

[۲] آپ کی وفات سنہ ۲۳۴ھ میں ہوئی اور آپ کا مزار مبارک بسطام میں ہے۔ آپ کا لقب سلطان العارفین، نام طیفور تھا۔ آپ کے دادا آدم بن سروشان آتش پرست تھے۔ آخر میں مشرف بہ اسلام ہوئے۔ آپ کا وطن بسطام ہے۔ آپ کے پیرو مرشد حضرت امام جعفر صادقؓ ہیں۔ اگرچہ آپ نے ابو حفصؒ حضرت یحییٰ معاذؒ اور حضرت شفیق بلخیؒ سے بھی (بقیہ اگلے صفحہ پر)

حضرت امام جعفر صادق رضی اللہ عنہ ہیں۔ حضرت بایزید بسطامیؒ نہ صرف اس سلسلے کی ترویج و اشاعت کی بلکہ اسے اپنی زندگی ہی میں فروغ بھی دیا۔ اس سلسلے کی بنیاد

(پچھلے صفحہ کا حاشیہ) ملاقات ہوئی۔ تذکرۃ الاولیاء میں ہے کہ آپ نے ۱۳ پیروں کی خدمت کی ہے۔ سید الطائفہ حضرت جنید بغدادیؒ نے فرمایا کہ بایزید ہمارے اندر اس طرح ہیں جیسے ملائکہ میں جبرئیل۔ ان بڑی بڑی باتوں میں سے جو بایزید بسطامیؒ کی بابت مشہور ہیں۔ ایک یہ ہے کہ شیخ الاسلام نے فرمایا کہ بایزید بسطامیؒ پر بڑے بڑے اتہام لگائے گئے ہیں۔ حضرت بایزید بسطامیؒ سے کسی نے پوچھا کہ سنت کس کو کہتے ہیں اور فرض کیا ہے؟ فرمایا سنت ترک دنیا ہے اور فرض خدا کی محبت ہے۔ نقل ہے کہ ایک دن آپ دجلہ پر گئے۔ دجلہ دونوں کناروں سے بھر آیا۔ آپ نے فرمایا کہ مجھے اس امر کے ظاہر کرنے میں ذرا بھی غرور اور فخر محسوس نہیں ہوتا کہ گو میں کیسا ہی بے حیثیت ہوں لیکن اپنی عمر کے ۴۰ سال کسی قیمت پر ضائع نہیں کر سکتا۔ مجھے کریم چاہئے کرامت نہیں چاہئے۔ (سفینۃ الاولیاء صہ ۱۰۵)

تذکرۃ الاولیاء میں نقل ہے کہ حضرت بایزیدؒ نے فرمایا کہ میں چاہتا ہوں کہ قیامت بہت جلد آوے تاکہ میں اپنا ڈیرہ دوزخ کے کنارے ڈالوں کہ جب مجھے دوزخ دیکھے تو سرد ہو جائے اور میں خدا کی مخلوق کے آرام کا سبب ٹھہروں۔ نقل ہے کہ حضرت بایزیدؒ نے فرمایا کہ میں ایک بار جنگل میں جا رہا تھا عشق کی بارش اس کثرت سے ہوئی کہ زمین تر ہو گئی۔ اور پاؤں پھسلنے لگا۔ میں عشق کے دلدل میں گلے تک اتر گیا اور آپ نے فرمایا کہ میں نے نماز سے سوائے تن کے استقامت کے اور کچھ نہ پایا۔ اور روزے سے سوائے پیٹ کے بھوکا رکھنے کے اور کچھ نہ پایا اور جو کچھ کہ پایا، اس کے فضل و کرم سے پایا۔ نہ اپنے عمل و فعل سے۔ پھر فرمایا کہ کوشش اور تحصیل سے کچھ حاصل نہیں کر سکتے۔ لیکن نیک بخت بندہ وہی ہے کہ کوشش اور محنت میں سرگرم رہے۔ کبھی نہ کبھی تو اس کا پاؤں خزانے پر جا ہی پڑے گا اور دولت مند ہو جائے گا اور فرمایا کہ جو شخص کہ آ کر میرا مرید ہو وے مجھے لازم ہے کہ مقام اعلیٰ سے مقام پست پر آؤں اور اس کی سمجھ بوجھ کے موافق اس سے گفتگو کروں۔ (سفینۃ الاولیاء صہ ۱۴۸)

سکر و غلبہ پر ہے یعنی ہمیشہ لوگ نشۂ الہٰی میں سرمست رہتے ہیں۔ آپ کی تعلیم ہے کہ عارف وہ ہے کہ جو بجز وصف دیدار الہٰی کسی چیز پر رضامند نہ ہو۔ آپ کا فرمان ہے کہ نیکوں کی صحبت، نیک کام کرنے سے بہتر ہے اور بروں کی صحبت برے کام کرنے سے زیادہ نقصان دہ اور مہلک ہے۔

اس سلسلے کا فیضان ہندوستان میں بھی پہنچا ہے۔ صوبہ بہار کے مشہور روحانی خطہ منیر شریف میں حضرت سید نعمت اللہ قادری فیروزپوری سے حضرت مبارک مصطفٰے جلال منیری کو پہنچا ہے۔

۱۶۔ سلسلہ خضریہ یہ حضرت خواجہ ابوالعباس خضر علیہ التحیہ والسلام سے منسوب ہے۔ اس سلسلے میں حضرت مخدوم جہانیاں جہاں گشت ہیں اور ان کی نسبت حضرت خواجہ ابوالعباس خضرؑ سے ہے۔ اور حضرت خواجہ ابوالعباس خضرؑ کو حضرت محمد مصطفٰے صلی اللہ علیہ وسلم سے ہے۔

۱۷۔ سلسلہ رفاعیہ یہ سلسلہ حضرت شیخ احمد کبیر رفاعی[1] رحمۃ اللہ علیہ سے منسوب ہے۔ جو حضرت شیخ ابوالفضل بن کامخ رح کے مرید ہیں۔ چاروا کوں

---

[1] آپ کی ولادت سنہ ۵۱۲ھ میں اور وصال سنہ ۵۷۸ھ میں ہوئی۔ مزار مبارک قریہ ام عبیدہ بطائح میں ہے۔
آپ حضرت علی بن موسیٰ کاظم رضی اللہ عنہما کے اولاد میں سے ہیں۔ آپکے والد کا نام ابوالحسن علی بن احمد بن یحییٰ بن حازم بن علی بن رفاعۃ المغربی ہے اور رفاعی آپ کے جد اعلیٰ رفاعہ کی طرف منسوب ہے۔ آپکے والد ماجد بلاد مغربیہ سے اگر بطائح کے قریب ام عبیدہ آرہے تھے کہ یہیں پر آپ سنہ ۵۱۲ھ میں پیدا ہوئے۔ آپنے اپنے وقت کے مشاہیر کرام سے تعلیم حاصل کی۔ آپ بڑے جلیل القدر بزرگوں اور مشائخ عظام میں سے تھے۔ آپ اللہ کے حکم سے نابینا کو بینا اور مردہ کو زندہ کرتے تھے۔ آپ کو آخر عمر میں حضرت غوث الاعظم سے فیض حاصل ہوا تھا۔ آپ کی والدہ ماجدہ کو حضرت غوث الاعظمؒ ہمیشہ کہا کرتے تھے اور ان سے ہمشیر حقیقی کی طرح محبت رکھتے تھے۔ آپ کی کرامات خرق عادات بکثرت ہیں۔ درندوں کی سواری کرنا سانپ و زہریلے حشرات الارض کو ہاتھ میں لینا، آگ میں گھس جانا، کھجوروں کے درخت پر چڑھنا اور زمین پر گر پڑنا اور ذرا بھی اذیت نہ ہونا وغیرہ خوارق میں ہیں۔ (مسالک السالکین ص ۳۹ جلد سوم)

کے بعد حضرت شیخ ابوبکر شبلیؒ کا نام آتا ہے۔

اس سلسلہ میں جذب و مستی بہت زیادہ ہے۔ سماع کا شغف زیادہ ہے اور وجد کی کیفیت طاری رہتی ہے۔ سلب امراض کا بھی جوہر ہے۔ عوام سے کنارہ کشی اختیار کر کے جنگل و صحرا میں رہتے ہیں اور حیوانات و درندے اس سلسلے کے بزرگوں سے مانوس، طرح طرح کے خرق عادات بھی ظاہر ہوتے رہتے ہیں۔ اس سلسلہ کا فروغ حجاز و شام میں زیادہ ہوا۔

۱۸۔ سلسلہ طاؤسیہ یہ سلسلہ حضرت شیخ ابوالخیر اقبال المتقلب من رسول الثقلین بطاؤس الحرمین سے منسوب ہے۔ آپ حضرت شیخ ابوالحسن السیروانیؒ کے مرید ہیں جو سید الطائفہ حضرت جنید بغدادیؒ کے مرید و مجاز ہیں۔

۱۹۔ سلسلہ منعمیہ المشہور مہیمنیہ یہ سلسلہ حضرت شیخ ابوالفضائل بن عبدالمنعمؒ سے منسوب ہے۔ آپ کے پیرو مرشد حضرت شیخ ابوالفتحؒ جو حضرت شیخ ابوسعید بن ابی الخیرؒ کے مرید و مجاز ہیں۔ اس سلسلہ کے مشہور بزرگ شیخ ابونصر سراجؒ ہیں۔ جو حضرت جنید بغدادیؒ کے مرید شیخ محمد رتعشؒ کے مرید و مجاز ہیں۔

مسالک السالکین فی تذکرۃ الواصلین تالیف مولوی مرزا محمد عبدالستار بیگ سہرامی میں چار پیر، چودہ خانوادے کے عنوان سے بعض سلاسل کا تذکرہ کیا ہے۔ کہ حضرت علی کرم اللہ وجہہ کے خلفا حضرت عبدالواحد بن زیدؒ اور حضرت خواجہ حبیب عجمیؒ سے بایں تفصیل جاری ہوئے۔

حضرت عبدالواحد بن زیدؒ سے پانچ خانوادے، زیدیہ، عیاضیہ، ادہمیہ، ہبیریہ، چشتیہ (یہ پانچوں خانوادے زیدیہ کہلاتے ہیں) حضرت خواجہ حبیب عجمیؒ سے ۹ خانوادے حبیبیہ، طیفوریہ، کرخیہ، سقطیہ، جنیدیہ، گازرونیہ، طوسیہ، فردوسیہ، سہروردیہ (یہ نو خانوادے حبیبیہ کہلاتے ہیں) لیکن ہمارے خاندان کے قلمی سفینوں میں صرف یہی ۱۹ سلاسل مذکور ہیں۔ بعض سفینوں کے مطالعہ سے یہ معلوم ہوتا ہے کہ اس سے بھی زیادہ

سلسلے ہیں۔ لیکن مرکزی حیثیت کے حامل نہیں بلکہ شاخ در شاخ ہیں اور نہ جانے سلسلہ چشتیہ، سلسلہ قادریہ، سلسلہ نقشبندیہ، سلسلہ فردوسیہ، سلسلہ قلندریہ، سلسلہ زاہدیہ کی کتنی شاخیں پیدا ہو سکتی ہیں۔ لیکن ہمارے یہاں ان کو نسبتیں یا واسطے کہتے ہیں جو عظیم شخصیتوں سے وابستہ ہیں۔ ان علمی سلسلوں میں کچھ تو ایسے ہیں جن کی صرف تاریخی حیثیت قائم ہے اور کچھ ایسے ہیں کہ پرانی خانقاہوں میں کبھی کبھی کوئی معتقد اس سلسلے میں داخل سلسلہ ہو جاتا ہے اور بعض سلسلے ایسے ہیں کہ کسی زمانے میں اس کی بڑی عظمت و شہرت تھی۔ لیکن اب اس کی اتنی وسعت نہیں صرف خاندانی اعتبار سے اس کی ترویج ہو رہی ہے۔ لیکن بعض سلسلے ایسے ہیں جن کی ہر زمانہ اور ہر دور میں شہرت و مقبولیت رہی ہے اور ابھی تک رشد و ہدایت کے فریضے انجام دے رہے ہیں۔ علمی سلاسل میں قادریہ، چشتیہ، نقشبندیہ، فردوسیہ، ابوالعلائیہ، شطاریہ، زاہدیہ، قلندریہ، سہروردیہ قابل ذکر ہیں۔ سلسلہ شطاریہ کو عہد جہانگیری میں بڑی مقبولیت رہی۔ سلسلہ زاہدیہ سلاطین شرقیہ کے عہد میں شہرت کا حامل رہا۔ اگرچہ آج بھی یوپی اور بہار میں ضلع سارن میں اس کی مقبولیت ہے۔ سلسلہ ابوالعلائیہ کی مقبولیت بارہویں صدی ہجری میں رہی اور ان کی خانقاہیں فیوض و برکات کی حامل ہیں۔ غرضکہ یہ تمام سلسلے نہ صرف رشد و ہدایت کے اہم فریضے انجام دیتے ہیں بلکہ اسی سے محبت، اخوت، انسان دوستی، اخلاق کی بلندی، عاجزی و انکساری، ایثار و قربانی کے جذبے پیدا ہوتے ہیں۔

مختصر یہ کہ ان تمام سلاسل کے فیوض جاری و ساری ہیں اور آج بھی ان سلاسل کی تعلیمات بزرگوں کے آستانے اور ان کی خانقاہوں میں دی جاتی ہیں۔ جو خدمت خلق اور انسان دوستی کے لئے کافی اہم ہیں۔ اور اسی سے انسانیت، اخوت کو فروغ اور ہدایت کا قیام ہے۔

صوبہ بہار اپنی عظمت دینی و روحانی کے اعتبار سے دوسرے صوبوں پر تفوق

کا حامل ہے۔ اسلام کے پہلے یہاں بودھ مذہب اور جین مذہب کی تعلیم اور ترویج کی ابتدا اسی صوبے سے ہوئی۔ راجگیر اور بہار شریف، اور یہاں کی نالندہ یونیورسٹی اپنی عظمت دیرینہ کی داستان سنا رہی ہے۔ ہندوستان اور بیرون ہندوستان سے تشنگانِ علم مذہبی وعلم روحانی آتے رہے اور فیضیاب ہو کر اپنے اپنے ملکوں میں بامراد واپس لوٹے ہیں۔ ہندوستان میں جب مسلمانوں کی اور بزرگان دین کی آمد ہوئی تو اس خطہ کو تقدم حاصل ہے۔ بختیار خلجی کے فتوحات بہار و بنگال سے پہلے مسلمانوں کی آمد صوبہ بہار میں ہو چکی تھی، اور بزرگان دین اپنا مشن لے کر سرگرم عمل تھے۔ حضرت خواجہ معین الدین چشتیؒ کی آمد سے پہلے حضرت مخدوم جہاں شیخ شرف الدین احمد یحییٰ منیریؒ کے پردادا حضرت امام محمد تاج فقیہہ ۵۷۶ھ میں جہاد کرتے ہوئے منیر شریف پہنچے وہ منیر شریف جو صوبہ بہار کا ایک تاریخی مقام ہے اس کو فتح کیا اور اسلام کا جھنڈا نصب کیا۔ منیر شریف پٹنہ سے تقریباً ۱۸ میل کی دوری پر واقع ہے۔ حضرت امام تاج فقیہہ بیت المقدس سے تشریف لائے لیکن ان کے ساتھ ساتھ حضرت غوث پاک سید محی الدین عبدالقادر جیلانی رحمۃ اللہ علیہ کے بھانجا حضرت میر قطبی ابدال بھی اور حضرت رکن الدین مرغیلانی اور حضرت میر قطب سالار ربانی بھی تھے۔ اس کے علاوہ مجاہدین کی ایک جماعت آپ کے جلو میں آئی اور منیر شریف کو فتح کیا۔ بختیار خلجی جس وقت صوبہ بہار پہنچا ہے اس وقت حضرت امام تاج فقیہہ کے پوتے اور حضرت مخدوم جہاںؒ کے والد حضرت مخدوم احمد یحییٰ منیریؒ منیر شریف کے انتظامی امور میں سرگرم عمل تھے۔ آپ نے بختیار خلجی کے حوالے اس قصبہ کا انتظام کر دیا۔ اگرچہ وہ انکار کرتا رہا اور مسلمانوں کی جیز نہ لینے کے وجوہات پیش کرتا رہا۔ ۵۷۶ھ کے بعد مسلمانوں کی آمد صوبہ بہار کے خطے میں کثرت سے ہوئی۔ چونکہ بہار و بنگال اختیار الدین بن بختیار خلجی کی جاں بازی اور اولوالعزمی سے قطب الدین ایبک کے زیر اقتدار آچکا تھا اور یہاں بودھ اور جین دھرم کی مذہبی اور روحانی فضا قائم تھی اس لئے تبلیغ اسلام کے لئے بھی یہ خطہ بہت موزوں ثابت ہوا۔ نتیجہ یہ ہوا کہ مختلف سلاسل کے بزرگان دین اپنا مشن لے کر سرگرم عمل رہے اور اپنی اپنی

خانقاہیں تبلیغ اسلام اور ترویج سلسلہ کے مقاصد کے تحت قائم کیں۔ چنانچہ حضرت پیر شہاب الدین جگ جوت (جو حضرت مخدوم جہاںؒ کے نانا تھے اور حضرت شیخ الشیوخ شہاب الدین سہروردیؒ کے مرید و خلیفہ) کی خانقاہ جیٹھلی (عظیم آباد) میں تھی۔ اسی طرح حضرت آدم صوفی جو حضرت بابا فریدالدین گنج شکرؒ کے مرید و خلیفہ تھے اور بہار شریف میں آپ ہی کے مرید و خلیفہ شیخ خضر پارہ دوست کے چشتی خانے تھے۔ سلسلہ سہروردیہ اور فردوسیہ کی خانقاہیں بھی عظمت کی حامل تھیں۔ سلسلہ زاہدیہ اور قادریہ کی تعلیمات بھی اسی خطہ سے زیادہ ہوئیں۔ مختصر یہ کہ ساتویں صدی ہجری میں صوبہ بہار کے مختلف خطوں میں تبلیغ اسلام اور ترویج سلسلہ کا کام پورے شباب پر تھا۔ سلاطین وقت کی عقیدت مندانہ نظر بھی اسی خطہ پر اٹھتی۔ چنانچہ محمد تغلق نے حضرت مخدوم جہاں شیخ شرف الدین یحییٰ منیریؒ کے لئے ایک خانقاہ تعمیر کی تھی۔ فیروز شاہ تغلق بھی نیازمندانہ بہار شریف حضرت مخدوم جہاںؒ کی خدمت میں پہنچا ہے۔ سکندر لودی نے بھی جبین عقیدت آپ کے آستانے پر جھکائی ہے۔ بابر جیسا بادشاہ بھی حضرت مخدوم احمد یحییٰ منیریؒ کے مزار مبارک سے فیضان حاصل کرنے کے لئے منیر شریف پہنچا ہے۔ مختصر یہ کہ صوبہ بہار کی خانقاہیں تبلیغ اسلام، ترویج سلسلہ اور اخوت و بھائی چارگی کی تعلیمات صلح و آشتی کا پیغام دینے کے لئے پیش پیش رہی ہیں۔ یہ خانقاہیں دینی اور روحانی یونیورسیٹیاں تھیں اس لئے اس پر تفصیلی روشنی ڈالی جاتی ہے۔

بہار کی خانقاہیں

تدوین حدیث اور تعمیر خانقاہ میں بڑی حد تک مماثلت ہے۔ اس لئے کہ پہلی صدی ہجری کے بعد جب سلاطین کے اقتدار کے تحت تمام علماء ہو گئے اور سلاطین کی دل جوئی اور اطاعت گزاری ان کا شعار بن گیا تو مسلمانوں میں بد دلی پیدا ہونے لگی اور مسلمانوں کا ایک طبقہ عرفان الٰہی اور رشد و ہدایت کے ساتھ ساتھ محبت و اخلاص کی تلاش میں صوفیائے کرام کی جھونپڑیوں کا متلاشی رہا۔ کیونکہ صوفیائے کرام ہی کی وہ ذات مقدس تھی جو سیاست اور فتنہ گری سے کنارہ کش ہو کر یاد الٰہی اور معرفت الٰہی میں مشغول بھی تھی۔ ان کی روحانی تربیت کے لئے ایک ایسے مقام کی ضرورت پیش آئی جہاں وہ بھی مشغول بحق ہوں اور ان کے تزکیۂ قلب اور تصفیۂ باطن کا سامان ہو۔ خانقاہ کا وجود دراصل اسی ضرورت کا نتیجہ تھا۔

یہ بھی حقیقت ہے کہ قرون اولیٰ میں مسجدوں کو افضلیت اور اولیت حاصل تھی۔ اس لئے کہ تمام مسائل مساجد ہی میں طے پاتے تھے، دینی ہو یا دنیاوی امور سب کو طے کرنے کے لئے الگ الگ جگہیں نہیں تھیں۔ انقلاب زمانہ کے ساتھ ساتھ جب عام مسلمانوں سے صوفیا کا گروہ الگ ہوا تو ان کی روحانی اور جسمانی تربیت کے لئے ایک الگ مقام کی ضرورت پیش آئی چنانچہ دوسری صدی ہجری میں ابو ہاشم صوفی نے صوفیا کی تعلیم و تربیت اور ذکر و فکر کی غرض سے شام کے مقام رملہ میں ایک خانقاہ کی تعمیر کی۔ اسلام میں تاریخی حیثیت سے یہی پہلی خانقاہ ہے۔

ہندوستان میں صوفیوں کے دور اولی کی خانقاہیں تعلیم و تربیت کی عظیم ذہنی اور روحانی یونیورسیٹیاں تھیں۔ یہ عظیم ادارے اسلام کی تبلیغ کے مراکز تھے۔ اور ان میں مسلمانوں کی ذہنی اور روحانی تربیت کی جاتی تھی۔ آج یہ خانقاہیں سونی پڑی ہیں گویا

ناپید ہوگئی ہیں۔ یہی پہلے مرجع خلائق تھیں اور معرفت الٰہی اور طمانیت قلب کا سامان۔

ہندوستان میں صوفیائے کرام محنت و مشقت اور راستوں کی صعوبت جھیلتے ہوئے محبت و اخوت کا سبق دینے کے لئے اور عوام سے اپنا گہرا رشتہ جوڑنے کے لئے آئے۔ ان بزرگوں نے نہ صرف ریاضت و عبادت ہی میں کمال حاصل کیا بلکہ اخوت اور انسانی محبت کے خیالات کو بھی پروان چڑھایا۔ اور اپنے ان خیالات کو درس و تدریس، کشف و کرامات اور تصنیف و تالیف کے ذریعہ عوام تک پہنچایا۔ یہی وجہ ہے کہ خلق خدا ان سے متاثر ہوئی اور عوام نے ان اثرات سے اپنے کو مہذب بنایا اور اس طرح ان کے فکر و عمل نے اس زمانے کی ثقافتی زندگی کو متاثر کیا۔ خانقاہ جس میں یہ بزرگان دین رشد و ہدایت کا سلسلہ قائم کرتے تھے اور جو ایک روحانی اسکول کی حیثیت رکھتی تھی، اس نے ایک بہت بڑا رول ادا کیا ہے۔ ان خانقاہوں میں عوارف و سلوک کے علاوہ فلسفہ و حکمت کی بھی تعلیم دی جاتی تھی۔ حدیث و تفسیر کی کتابوں پر مذاکرہ علمی ہوتا تھا۔ اور ان خانقاہوں میں بچوں کی ابتدائی تعلیم یعنی رسم بسم اللہ بھی ہوتی تھی۔ جو بزرگوں کے ذریعہ حصول برکت و سعادت کے لئے انجام پاتے تھے۔ اسی لئے کہا جاتا ہے کہ یہ خانقاہیں فعال مراکز تہذیب تھے۔

ہندوستان میں اور صوبوں کی طرح صوبہ بہار بھی تبلیغ اسلام اور رشد و ہدایت کے لئے پیش پیش رہا ہے۔ اور عہد قدیم ہی سے اس کے فیوض و برکات سارے ہندوستان میں پھیلنے لگے۔ چنانچہ عصر قدیم میں یعنی عہد غوریہ کے مطابق صوبہ بہار کے مختلف سلاسل کی خانقاہیں اور چشتیوں کے جماعت خانے بھی تعلیم دینی اور فیوض روحانی کے لئے مشہور و معروف تھیں۔ دور دور سے تعلیم روحانی، تزکیۂ نفس اور تصفیہ قلب کے لئے مختلف سلاسل کے خانوادے اس سرزمین میں تشریف لائے۔ چنانچہ ۵۷۶ھ میں حضرت مخدوم جہاں شیخ شرف الدین یحییٰ منیریؒ کے پردادا حضرت امام محمد تاج فقیہ کی سرکردگی میں مسلمانوں کا ایک کارواں ذوقِ جہاد سے سرشار ہوکر پٹنہ سے سولہ میل دور ایک مشہور تاریخی خطہ منیر شریف میں وارد و پذیر ہوا۔ آپ کے ساتھ ہی ساتھ صوفیائے کرام کا

مبارک قدم بھی آیا۔ اسی خطے میں سب سے پہلی خانقاہ قائم ہوئی۔ حضرت مخدوم جہاں رح کے والد حضرت مخدوم احمد یحیٰی منیری رح کی سہروردی خانقاہ اور پھر آپ کے بڑے صاحبزادے حضرت مخدوم جلیل الدین منیری رح کا فردوسی فیضان اسی خانقاہ سے جاری و ساری ہوا۔ یہ خانقاہ اپنی عظمت و اہمیت کے لحاظ سے قدیم اور منفرد ہے۔ اس خانقاہ میں سلاسل سہروردیہ، فردوسیہ، چشتیہ، زاہدیہ، شطاریہ اور قادریہ کا بہت فروغ ہوا۔

تزک بابری میں تحریر ہے کہ منیر شریف سے شہنشاہ بابر جب گذرا تھا تو اسے معلوم ہوا کہ یہاں قدوۃ العارفین حضرت مخدوم احمد یحیٰی منیری رح کا آستانہ ہے اور آپ کی خانقاہ ہے تو اس نے نذورات اور تحائف خانقاہ میں پیش کئے۔

شہنشاہ ہندوستان شیر شاہ سوری اسی خانقاہ کے مشہور بزرگ حضرت مخدوم بڑن منیری رح کا مرید تھا۔ دسویں صدی ہجری میں اسی خانقاہ کے سجادہ نشیں اور خانوادہ فردوسیہ کے عظیم المرتبت بزرگ حضرت مخدوم شاہ دولت منیری رح ہیں۔ جن کی شہرت و عظمت کا چرچا ہندوستان گیر طور پر ہوا۔ عہد اکبری کا ایک ممتاز رتن عبد الرحیم خانخاناں اور صوبہ گجرات کا گورنر ابراہیم خاں کانکڑ آپ ہی کا مرید تھا۔ اور حسن عقیدت سے آپ کا سنگی روضہ بنوایا۔ جو فن تعمیر کا شاہکار ہے۔

راجہ مان سنگھ کی عظمت عہد اکبری میں ایک مسلمہ حقیقت ہے اس کے متعلق مآثر الامراء میں تحریر ہے کہ راجہ مان سنگھ حضرت مخدوم شاہ دولت منیری رح کی خانقاہ میں بار بار حاضر ہوا ہے۔ اور حضرت مخدوم سے ملاقی ہوا۔ مذاکرہ علمی ہوا اور ان کی صحبت سے مستفیض ہوا۔ اور ان سے ان کی دعاؤں کا طلب گار ہوا۔ ہندوستان کا مشہور موسیقار تان سین بھی اسی خانقاہ میں آکر حضرت قطب موحد بلخی رح سے شرفیاب ہوا ہے اور آستانۂ حضرت مخدوم احمد یحیٰی منیری رح پر اس نے سعادت کی خاطر کچھ اشعار گائے ہیں۔ جس سے اس کے حسنِ عقیدت کا پتہ چلتا ہے۔

سلاطین مغلیہ بزرگان دین کے بڑے معتقد رہے ہیں۔ اس اعتقاد کا ثبوت بزرگوں کی خدمت اور نذورات کی شکل میں پیش کیا ہے۔

خانقاہ منیر میں سلاطین ہند کے کچھ تو فرامین زمانے کے دستبرد سے محفوظ نہ رہ سکے۔ لیکن اب بھی کچھ فرامین ایسے ہیں جس سے سلاطین ہند کی عقیدت اور خدمت کا اندازہ ہوتا ہے۔ سلاطین ہند میں سے شاہجہاں، سلطان پرویز، شاہ شجاع، اورنگ زیب عالمگیر، فرخ سیر، شاہ عالم وغیرہ کے فرامین آج بھی خانقاہ میں محفوظ ہیں۔ جس سے اس خانقاہ کی عظمت کا اندازہ کیا جا سکتا ہے۔ سلاطین ہند کو اس خانقاہ سے کس قدر عقیدت تھی۔ اور اس خانقاہ کی خدمت کو اپنے لئے باعث سعادت اور موجب فیض و برکت سمجھتے تھے۔

منیر شریف کی اس خانقاہ پر مشائخین اور صوفیائے کرام کی بھی نظر عقیدت پڑتی تھی۔ چنانچہ حضرت شرف الدین ابو توامہ جیسے شیخ وقت اور عالم متبحر نے کچھ دنوں اسی خانقاہ میں دہلی سے سنار گاؤں جاتے ہوئے قیام فرمایا تھا[1]

حضرت سیدنا امیر ابو العلیٰ نے بردوان سے آگرہ جاتے ہوئے اسی خانقاہ میں کچھ دنوں قیام فرمایا اور اسی خانقاہ کے صاحب سجادہ حضرت مخدوم شاہ دولت منیریؒ سے فیضیاب ہوئے۔[2]

سلسلہ قادریہ کے عہد شاہجہانی کے مشہور بزرگ حضرت نعمت اللہ قادری فیروز پوری نے حضرت مخدوم شاہ دولت منیریؒ کے نواسے حضرت مبارک مصطفےٰ جلال منیریؒ کو بنفس نفیس تشریف لاکر اسی خانقاہ میں اپنی امانتیں عطا فرمائیں۔ اذکار و اشغال کی تعلیم کی اور سلوک کی راہیں طے کراکے اپنا خلیفہ و مجاز بنایا۔[3]

یہ خانقاہ علمی طور پر بھی بہت مشہور رہی ہے۔ سلسلہ سہروردیہ اور فردوسیہ کا فیضان تو خاص طور پر جاری ہوا لیکن سلسلہ قادریہ، چشتیہ، زاہدیہ

---

[1] مناقب الاصفیاء وسیلۂ شرف و ذریعہ دولت ص۱۶ مرتبہ ڈاکٹر محمد طیب ابدالی

[2] اسرار ابو العلیٰ ص۱۵ بحوالہ خمخانۂ تصوف مصنفہ ڈاکٹر ظہور الحسن شارب ص۲۶۴

[3] مناہج الشطار ملفوظ حضرت مخدوم رکن الدین جندھی

شطاریہ، قلندریہ کے تعلیمات اوراذکار واشغال کی بھی تعلیم دی جاتی ہے۔

بہار شریف کی عظمت واہمیت ہندوستان کی تاریخ کا ایک زریں باب ہے۔ خواہ ہندو ہوں یا مسلمان، بودھ دھرم والے ہوں یا جین مذہب والے، سبھوں کو اس کی عظمت کا اعتراف ہے۔ ساتویں صدی ہجری ہی سے چشتیوں کے جماعت خانے بہار شریف میں قائم ہوگئے تھے۔ چنانچہ سیر الاولیاء میں یہ مذکور ہے کہ حضرت نظام الدین اولیاء، حضرت بابا فریدالدین گنج شکرؒ کے وصال کے بعد جب غیاث پور آئے تو ایک مسافر سے معلوم ہوا کہ بہار میں ایک خانقاہ تعمیر ہوئی ہے۔ اصل میں یہ خانقاہ حضرت فریدالدین گنج شکرؒ کے مرید وخلیفہ شیخ خضر پارہ دوزت نے تعمیر کرائی تھی۔ حضرت نظام الدین اولیاء اپنی شہرت سے گھبرا چکے تھے۔ اس لئے انہوں نے ارادہ ظاہر کیا کہ بہار میں جاکر اس خانقاہ میں خلوت نشینی کی جائے۔ اور درس وتدریس کا بھی موقع بہتر ہے۔ اپنے بعض مشاغل کی وجہ سے اس ارادہ کو عملی جامہ نہ پہنا سکے تھے کہ شیخ خضر کا مراسلہ پہنچا کہ آپ کا یہاں انتظار کیا جارہا ہے۔ آپ نے فرمایا کہ جس وجہ سے بہار کا ارادہ تھا اب تو وہاں بھی وہی ہے۔ اب جانے سے کیا فائدہ؟ اسی چشتی خانہ کی یادگار میں ابھی بھی چشتیانہ محلہ قائم ہے۔

اس کے علاوہ بہار میں سلسلہ فردوسیہ، سہروردیہ، چشتیہ، زاہدیہ، قادریہ اور قلندریہ کی خانقاہیں رشد وہدایت اور روحانی تعلیم وتربیت کے لئے مشہور تھیں۔ دُور دُور سے صوفیائے کرام اور رہروانِ معرفت وطریقت اس سرزمین پر عہد بہ عہد اپنا مشن لے کر آتے رہے۔ آج بھی تحقیق وجستجو کی جائے تو قدیم خانقاہوں کے اثرات جا بجا ملیں گے۔ اب تک کی تحقیقات کی رو سے بہار شریف میں چشتیوں کے جماعت خانے اور مخدوم جہاںؒ اور مخدوم احمد چرم پوشؒ کی خانقاہ کا پتہ تاریخی اعتبار سے ملتا ہے۔

مناقب الاصفیاء میں تحریر ہے کہ نظام الدین مولیٰ مرید ومجاز حضرت نظام الدین اولیاء نے اپنے مال مزکی سے مخدوم جہاںؒ کے لئے ایک خانقاہ تعمیر کی تھی۔ پھر جب آپ کی شہرت ہوئی اور سلطان محمد تغلق کو معلوم ہوا تو گورنر بہار مجدالملک کو یہ حکم دیا کہ شیخ الاسلام شیخ شرف الدین احمد یحییٰ منیریؒ کے لئے بہار شریف میں ایک خانقاہ تعمیر کراؤ۔

چنانچہ آپ کے لئے سلطان محمد تغلق نے ایک خانقاہ تعمیر کرائی جس میں رشد و ہدایت کا سلسلہ جاری ہوا۔ سجادگان مخدوم جہاںؒ حضرت مولانا مظفر بلخیؒ، حضرت حسین نوشہ توحید بلخیؒ اور حضرات بلخیہؒ اسی خانقاہ میں رشد و ہدایت اور فیضان کو جاری و ساری رکھا۔ چشتیوں کے جماعت خانے جسے دوسرے لفظوں میں خانقاہ کہئے، رشد و ہدایت کے فریضے انجام دے رہے تھے۔ اگرچہ مخدوم جہاںؒ کی خانقاہ سے پہلے ہی یہاں چشتیوں کے جماعت خانے تھے لیکن ابھی تک اس کے تواتر کا پتہ نہیں چلتا۔ البتہ حضرت فریدالدین طویلہ بخش جو حضرت نظام الدین اولیاؒ کے بھائی جمال الدین کے پوتے تھے۔ اور حضرت نور قطب عالم پنڈوہ کے داماد اور مرید مجاز تھے۔ سلسلہ چشتیہ کی اشاعت خاص ان کی خانقاہ سے زیادہ ہوئی۔ بہار شریف کے محلہ چاند پورہ میں آپ کی خانقاہ رشد و ہدایت کے لئے مشہور تھی۔ حضرت فریدالدین طویلہ بخش کی اولاد میں حضرت دیوان شاہ عبدالوہاب تکیہ خردؒ مشہور بزرگ گزرے ہیں۔ ان کی خانقاہ محلہ تکیہ خرد میں تھی، جو چشتی فیضان کے لئے مشہور تھی۔ حضرت مخدوم جہاںؒ کے خالہ زاد بڑے بھائی حضرت مخدوم احمد چرم پوش سہروردیؒ، سلسلہ سہروردیہ کے مشہور بزرگ تھے۔ بہار شریف محلہ انبیر میں آپ کی خانقاہ رشد و ہدایت اور فیضان کے لئے خاص طور پر نمایاں ہے۔ سلطان فیروز شاہ تغلق بھی آپ سے ملنے کے لئے آپ کی خانقاہ میں عقیدت مندانہ حاضر ہوا ہے۔ جس کی تفصیل سیرت فیروز شاہی اور فوائد رکنیہ میں ہے۔ حضرت مخدوم سید احمد چرم پوشؒ کے پیر و مرشد شیخ علاءالحق مہسویؒ ہیں اور ان کے پیر و مرشد شیخ سلیمان دھکڑ پوش ہیں۔ اور وہ حضرت تقی الدینؒ مادرزاد حافظ سے مرید تھے، وہ حضرت شیخ الشیوخ شہاب الدین سہروردیؒ کے مرید و خلیفہ حضرت شیخ احمد دمشقیؒ کے مرید ہیں۔ اس طرح پر سلسلہ سہروردیہ کی نسبت آپ تک پہنچی ہے۔

سلسلہ زاہدیہ کے گراں قدر اور با فیض بزرگ حضرت مخدوم شاہ بدرالدین بدر عالم زاہدیؒ کی شہرت بنگال و بہار میں کافی ہوئی۔ حضرت مخدوم جہاںؒ نے اپنی زندگی ہی میں حضرت کو چاٹگام سے بہار شریف بلایا تھا۔ لیکن یہ بھی عجب اتفاق ہے کہ

آپ حضرت مخدوم جہاںؒ کے وصال کے بعد بہار شریف پہنچے۔ بادشاہِ وقت بھی آپ کے بڑے معتقد تھے اور آپ کے نام سے سکہ چلایا تھا۔ آپ کی صاحبزادی بی بی ابدال بھی بہت بڑی بزرگ کاملہ تھیں اور آبادی سے دُور جنگل میں یادِالٰہی میں مشغول رہتیں۔ آپ کی شہرت وعظمت بہت زیادہ ہوئی۔ انھیں سب وجوہ کی بنا پر آپ کی خانقاہ کی شہرت رشد و ہدایت اور فیضان کے اعتبار سے بہت زیادہ ہوئی۔

کشمیر کے ایک جلیل القدر بزرگ سید علی ہمدانیؒ ہیں۔ ان کے پوتا سیدؒ علاءالدین ہمدانی کی خانقاہ بھی اپنے عہد کی ممتاز اور معروف خانقاہ رہی ہے۔ اس خانقاہ سے سلسلہ قادریہ اور سہروردیہ کا خاص فیضان ہوا اور اوراد و اذکار کی اجازت و خلافت اس عہد کے بڑے بڑے بزرگوں نے اس خاندان سے حاصل کی ہے۔

سلسلہ چشتیہ کے مشہور بزرگ حضرت محمد عیسیٰ تاج جون پوریؒ ہیں۔ آپ کے چھوٹے بھائی حضرت احمد عیسیٰ تاج ہیں۔ آپ کی خانقاہ بہار شریف کے محلہ بھینسا سور میں مشہور خاص و عام تھی۔

بہار شریف کے محلہ بارہ دری میں سلسلہ قادریہ اور قلندریہ کے مشہور بزرگ حضرت میر فضل اللہ گوسائیں حضرت قطب الدین بینائے دل جون پوریؒ کے داماد و مرید و مجاز ہیں۔ جن کی عظمت و بزرگی کا چرچا تھا۔ ان کی خانقاہ رشد و ہدایت کے لئے اتنی مشہور و معروف ہوئی کہ سلسلہ قادریہ اور سلسلہ قلندریہ کا فیضان خاص اس خانقاہ سے صوبہ بہار کی اکثر خانقاہوں میں پہنچا۔ آپ کا فیضان حضرت منعم پاکبازؒ کو پہنچا ہے۔ اور اسلام پور، خسرو پور، شیخ پورہ، بہار شریف، دانا پور، رام ساگر گیا کی خانقاہوں میں سلسلہ قادریہ کا فیضان آپ ہی کے واسطے سے پہنچا ہے۔

بہار شریف میں محل پر ایک مشہور محلہ ہے۔ یہاں حضرت دیوان محمد رشید جونپوریؒ کے خلیفہ و مجاز حضرت میر جعفر پٹنویؒ کی خانقاہ علم و فضل اور اذکار و اشغال کے اعتبار سے بڑی ممتاز رہی۔ چونکہ حضرت دیوان محمد رشید جون پوریؒ ہندوستان کے عالم متبحر تسلیم کے جاتے تھے اور ان کے یہ بڑے جاں نثار اور قابل فخر خلیفہ تھے۔ اس لئے بھی ان کی

خانقاہ کی عظمت و شہرت زیادہ ہوئی اور یہ خانقاہ علم و فضل اور اذکار و اشغال کے اعتبار سے بڑی ممتاز رہی ہے۔

حضرت قمیص قادریؒ کی خانقاہ محلہ گدڑھ پر بہار شریف میں ہے۔ حضرت غوث پاکؒ کی تیرہ پشت کے بعد آپ کی اولاد میں حضرت مخدوم عطاء اللہ بغدادیؒ حضرت مخدوم جہاںؒ کے بعد بہار شریف آئے۔ آپ کو سلسلہ قادریہ کی اجازت حضرت سید حسین قادریؒ سے اور سلسلہ چشتیہ کی اجازت و خلافت حضرت نور قطب عالم پنڈوی سے ہے۔ اس لئے آپ کی خانقاہ سے سلسلہ قادریہ اور چشتیہ کا فیضان جاری ہوا۔

اس کے علاوہ بھی بہار شریف میں چھوٹی چھوٹی خانقاہیں ہیں جو اپنے عہد میں بڑی مشہور تھیں۔ لیکن آج پردہ گمنامی میں ہیں۔ اگرچہ ان کا فیض متروک ہے۔ لیکن ان کا نام باقی ہے۔

حضرت مخدوم جہاںؒ کے تعلیمات دینی اور فیوض روحانی بہار شریف ہی تک محدود نہ رہی۔ بلکہ ان کے عہد ہی میں ان کے خلفاء کی خانقاہیں صوبہ بہار کے مختلف خطے میں قائم ہو گئیں اور رشد و ہدایت کی کرنیں وہاں سے پھوٹنے لگیں۔

بہار شریف سے کچھ فاصلے پر ایک مشہور قصبہ ہے، جسے شیخ پورہ کہا جاتا ہے۔ مخدوم جہاںؒ کے مرید و خلیفہ اور چچازاد بھائی حضرت مخدوم شعیبؒ کی خانقاہ سلسلہ فردوسیہ کی تعلیمات اور فیضان کے لئے مخصوص تھی۔ حضرت مخدوم جہاںؒ بذات خود یہاں حضرت مخدوم شاہ شعیبؒ کی تعلیم روحانی کے لئے تشریف لاتے تھے۔ کہا جاتا ہے کہ بہار شریف کے بعد دوسری قدیم خانقاہ یہی ہے۔ یہاں سے سلسلہ فردوسیہ کی ترویج و اشاعت بہت زیادہ ہوئی اور نسلاً بعد نسلٍ آج بھی اس خانقاہ سے رشد و ہدایت کی تعلیم جاری و ساری ہے۔

حضرت مولانا آموںؒ حضرت مخدوم جہاںؒ کے مرید و خلیفہ تھے۔ مخدوم جہاںؒ اکثر آپ ہی کے موضع ہو کر شیخ پورہ حضرت شاہ شعیبؒ کے یہاں جاتے تھے۔ اس بستی کا نام

ابراہیم پور چرداواں ہے۔ مخدوم جہاںؒ نے وہاں اپنے دست مبارک سے کلیجکاں کا درخت نصب فرمایا تھا اور ایک باغ لگانے کی تاکید فرمائی تھی۔ چنانچہ اسی جگہ میں حضرت مولانا آموںؒ (وفات ۸۴۴ھ) کی خانقاہ تعمیر ہوئی۔ آپ کے بعد آپکے صاحبزادے حضرت ارزانیؒ کی بڑی شہرت ہوئی اور سلسلہ فردوسیہ کا فیضان جاری ہوا۔

حضرت مخدوم جہاںؒ کے مرید و مجاز حضرت سید علیم الدین گیسو دراز نیشاپوریؒ ہیں۔ آپ کی شہرت حضرت امام جعفر صادقؓ کے صاجزادے امام محمد دیباجؒ کی اولاد کی وجہ سے صوبہ بہار میں بہت زیادہ ہوئی۔ آپ نیشاپور سے آکر حضرت مخدوم جہاںؒ کے حلقۂ ارادت میں داخل ہوئے۔ سلسلہ فردوسیہ کا فروغ ہوا۔ اگرچہ آپ پھر واپس چلے گئے لیکن آپ کے دو صاجزادے حضرت سید محمد فردوسیؒ اور حضرت سید احمد فردوسیؒ اپنے والد و مرشد سے سلسلہ فردوسیہ میں مرید تھے۔ حضرت ہی نے انہیں اپنا جانشیں بنایا۔ حضرت پیر بدر الدین بدر عالم زاہدیؒ سے سلسلہ زاہدیہ کی بھی اجازت و خلافت تھی۔ آپ کی درگاہ اور خانقاہ موضع معافہ میں ہے جو اسلام پور سے چودہ میل دکھن جانب پیمار ندی کے کنارے واقع ہے۔ اس خانقاہ سے بھی سلسلہ فردوسیہ کی رشد و ہدایت کافی ہوئی۔ حضرت فرزند علی صوفی منیریؒ کے والد حضرت محمد علی ابدالی تک اب خانقاہ کا فیضان مسدود ہو گیا۔

حضرت مخدوم جہاںؒ کے ایک مرید و مجاز حضرت شمس الدین محمود خضر بدایونیؒ ہیں۔ ان کی خانقاہ قتال پورہ میں مشہور خاص و عام تھی۔ ان کے پرپوتے حضرت دیوان حبیب اللہ قادریؒ نے اسلام پور ضلع نالندہ میں بود و باش اختیار کر کے اپنی خانقاہ قائم کی اور اپنی صاجزادیوں کی شادیاں ہمدانی، بلخی اور ابدالی بزرگوں سے کیں۔ یہی وجہ ہے کہ اس حالت سے نہ صرف سلسلہ قادریہ اور فردوسیہ کا فیضان جاری ہوا بلکہ سلاسل سہروردیہ، ہمدانیہ، زاہدیہ کی تعلیمات روحانی بھی جاری و ساری ہوئیں۔ حضرت سید شاہ ولایت علیؒ اس سلسلے کے بارہویں صدی ہجری کے بہت مشہور اور بافیض بزرگ تھے۔

سلسلہ فردوسیہ کے فیوض و برکات اور رشد و ہدایت کے فریضے انجام دینے کیلیے اس کی مختلف شاخیں قائم ہو گئیں۔ اس کی ایک شاخ دیورہ ضلع گیا پہنچی اور وہاں فردوسی خانقاہ نے رشد و ہدایت اور تعلیمات روحانی کو وسیلہ بنایا، پھر ضلع اورنگ آباد کے مقام سملہ میں بھی فردوسی خانقاہ قائم ہوئی۔

بہار شریف میں مخدوم جہاں کی خانقاہ میں تو حضرت حافظ بلخی رحمۃ مسند رشد و ہدایت کے اہم فریضے انجام دیتے رہے لیکن ان کے منجھلے بھائی حضرت درویش بلخی رح منیر شریف پہنچے جہاں ان کی شادی ہوئی تھی اور چھوٹے صاحبزادے حضرت شاہین بلخی رح تھے جو خانقاہ مجیبیہ میں پہنچے اور ان کی اولاد نے سلسلہ فردوسیہ کی تعلیمات اور فیضان کو جاری رکھا۔

حضرت درویش بلخی رح کے دو صاحبزادے تھے۔ بڑے صاحبزادے حضرت رکن الدین بلخی رح جو مسند رشد و ہدایت پر جلوہ افروز ہوئے اور آپ ہی کے صاحبزادے حضرت بڑن منیری رح جو خیر شاہ کے پیر و مرشد اور حضرت مخدوم شاہ دولت منیری رح کے ماموں تھے۔ آپ ہی کے عہد میں خانقاہ منیر شریف کی بڑی عظمت و شہرت ہوئی اور امرائے عہد اکبری و جہانگیری آپ کے دامن سے وابستہ ہوئے اور خانقاہ میں حاضری دی۔ حضرت رکن الدین بلخی رح کے دوسرے بھائی حضرت احمد بلخی رح تھے جن کی شادی اسلام پور خانقاہ میں ہوئی اور وہاں ہمدانیوں اور قادریوں کا فیضان خاص تھا۔ اس میں دوسری نسبت کا بھی اضافہ ہوا اور اس طرح پر سلسلہ فردوسیہ بلخیہ کا بھی فیضان جاری ہوا۔ حضرت حافظ بلخی رح کے پوتے تو بہار شریف ہی میں مسند سجادگی پر رشد و ہدایت کے سلسلے کو قائم رکھا لیکن آپ کے بعد آپ کی اولاد استقال مکانی کیا۔ اور مختلف جگہ ہوتے ہوئے فتوحہ پہنچے اور یہاں حضرت تقی بلخی رح سے اس سلسلہ فردوسیہ کو بہت فروغ ہوا اور یہاں بلخیوں کی خانقاہ رشد و ہدایت قائم ہو گئی۔ جس سے فیوض علمی اور تعلیمات روحانی جاری و ساری ہیں۔

عہد شاہجہانی کے ایک جلیل القدر بزرگ حضرت مولانا شہباز بھاگلپوریؒ ہیں۔ شہنشاہ شاہجہاں آپ کی خدمت میں حاضر ہو کر دعا کا طالب ہوا ہے۔ آپ پہلے تو ایک مدرسہ میں علوم دینیہ کی تعلیم دیتے تھے۔ لیکن ساتھ ہی ساتھ تزکیہ نفس اور تصفیہ قلب کے ذریعہ رشد و ہدایت کرنے لگے۔ آخر یہ مدرسہ خانقاہ میں منتقل ہو گیا۔ چونکہ آپ فردوسی اور قادری بزرگ تھے اس لئے اس خانقاہ سے ان سلاسل کا فیضان جاری ہوا۔

سلسلہ سہروردیہ کے ایک مشہور بزرگ حضرت سید محمد پیر دمڑیا تھے۔ ان کی خانقاہ خلیفہ باغ بھاگلپور میں تھی جس سے سلسلہ سہروردیہ کے فیضان جاری و ساری ہوئے۔

نویں صدی ہجری میں سلسلہ شطاریہ کے مشہور بزرگ حضرت ابوالفیض قاضن علا شطاریؒ ہیں جو حضرت عبداللہ شطاریؒ کے خلیفہ و مجاز ہیں۔ آپ کی خانقاہ دیشالی ضلع مظفرپور میں رشد و ہدایت کے لئے بڑی مشہور و معروف تھی آپ کے ایک صاحبزادے حضرت عبدالرحمان شطاریؒ ہیں جن کی خانقاہ مظفرپور میں اور چھوٹے صاحبزادے حضرت ابوالفتح ہدایت اللہ پیر پرست شطاریؒ کی خانقاہ حاجی پور میں مشہور زمانہ تھی۔ آپ ہی سے حضرت شیخ ظہور حاجی حمیدالدین حضورؒ کو اجازت و خلافت ملی ہے۔ آپ نے چالیس برسوں تک مدینہ منورہ میں جاروب کشی کی ہے۔ وہاں سے آکر اپنی خانقاہ گوپال گنج کے قصبہ رتن سرائے میں قائم کی۔ اور رشد و ہدایت کا سلسلہ جاری کیا۔ آپ کے مرید حضرت شیخ پھولؒ اور حضرت سید محمد غوث گوالیاریؒ ہیں۔ ان سے سلسلہ شطاریہ ہندوستان گیر طور پہ مشہور ہوا۔ شہنشاہ جہانگیر حضرت شیخ پھولؒ کا معتقد تھا اور ہندوستان کا مشہور موسیقار تان سین حضرت شیخ محمد غوث گوالیاری کا مرید تھا۔

سلسلہ شطاریہ کے بہت مشہور اور بافیض بزرگ حضرت مخدوم رکن الدین شطاری جندھیؒ ہیں۔ ان کی خانقاہ جندھا میں مرجع خلائق تھی اور آپ ہی کے مرید و

مجاز اور اپنے عہد کے عظیم المرتبت بزرگ حضرت پیر امام الدین راجگیری شطاریؒ ہیں جو نہ صرف علم و فضل میں یکتائے روزگار تھے بلکہ صاحب تصانیف بھی ہیں۔ آپ کی خانقاہ جہاں پناہ میں رشد و ہدایت اور سلاسل کی بڑی اشاعت ہوئی۔

درگاہ چمنی بازار پورنیہ میں بھی سلسلہ چشتیہ کی ایک بڑی ممتاز اور معروف خانقاہ تھی۔ حضرت دیوان محمد رشید جون پوریؒ کے والد و پیر و مرشد حضرت شیخ مصطفےٰ جمال الحقؒ حضرت نور قطب عالم پنڈویؒ کے ساتویں پشت کے بعد سلسلہ چشتیہ کے مشہور بزرگ ہیں۔ اس خانقاہ سے سلسلہ چشتیہ کا فیضان کافی ہوا۔ اگرچہ آپ کے بعد آپ کے صاحبزادے دیوان محمد رشید جون پوریؒ نے اپنی مستقل خانقاہ جون پور میں قائم کی۔ اور سلسلہ قادریہ کی اجازت حضرت شمس الدین کالپیؒ سے، سلسلہ قلندریہ فردیہ کی اجازت حضرت عبدالقدوس قلندرؒ سے، سلسلہ چشتیہ کی اجازت حضرت مخدوم طیب بنارسیؒ سے ملی ہے۔ حضرت دیوان محمد رشید جون پوریؒ اور آپکے اخلاف نے اس آستانے اور خانقاہ کو کبھی بھی فراموش نہیں کیا بلکہ تمام سجادگان رشیدیہ عہد بہ عہد اس خانقاہ کی تعلیمات روحانی اور رشد و ہدایت کے فریضے کو اس خانقاہ میں بیٹھ کر انجام دیتے رہے ہیں۔ یہ خانقاہ آج بھی پورنیہ میں اپنی عظمت و شہرت کے اعتبار سے بڑی ممتاز ہے۔

سلسلہ قادریہ کی ایک بہت ہی قدیم اور عظمت کی حامل خانقاہ امجھر شریف ضلع اورنگ آباد میں ہے۔ چونکہ حضرت سید محمد امجھریؒ حضرت غوث پاک کی اولاد میں سے ہیں۔ اور بارہویں پشت میں ہیں۔ اس لئے آپ کی خانقاہ کی عظمت منفرد حیثیت رکھتی ہے۔ سلسلہ قادریہ کی وسعت و شہرت اس خانقاہ سے بہت زیادہ ہوئی اور نسلاً بعد نسلٍ اس اہم فریضے کو یہاں کے سجادگان نے بڑے حسن و خوبی سے انجام دیا۔ نویں صدی ہجری کی یہ خانقاہ رشد و ہدایت اور مقبولیت کے لئے صوبہ بہار میں امتیازی درجہ کی حامل ہے۔

حضرت سید تا سید محمد امجھریؒ کی اولاد میں سے ایک بافیض بزرگ حضرت

سیلمان قادری اجھریؒ نے گیارہویں صدی ہجری میں داؤ دنگر ضلع گیا میں ایک خانقاہ قائم کی اور اس میں رشد و ہدایت کی تعلیم بڑے آب و تاب کے ساتھ ہوئی۔
سیوان ضلع سارن میں بزرگوں کے مسکن ہونے کا شرف رکھتا ہے۔
حضرت پیر بدرالدین بدرعالم زاہدیؒ کے صاحبزادے حضرت شہاب الدین قتال زاہدیؒ کی خانقاہ جو کی قتال ضلع سیوان میں بڑی شہرت کی مالک رہی۔ ابھی تک وہاں اس زمانے کے تبرکات محفوظ ہیں۔ جس سے اس خانقاہ کی عظمت کا پتا چلتا ہے۔ ان بزرگوں نے اسلام بھی پھیلایا ہے، رشد و ہدایت بھی کی ہے، اور محبت و اخوت کا درس بھی دیا ہے۔
ضلع سیوان میں بہمن بوہ شریف ایک مشہور مقام ہے جو جو کی قتال کے متصل ہی ہے۔ یہاں بارہویں صدی ہجری کی ایک مشہور خانقاہ ہے۔ اس خانقاہ کو حضرت دیوان محمد رشید جون پوریؒ کے سجادگان میں سے حضرت نورالحق شاہ حیدر بخش نے قائم کیا۔ حضرت قطب الہند غلام معین الدین رشیدیؒ پیر و مرشد حضرت عبدالعلیم آسی غازی پوریؒ سے اس خانقاہ کو بہت فروغ ہوا اور اس سے سلسلہ قادریہ چشتیہ اور زاہدیہ کے فیوض جاری و ساری ہوئے۔
حسن پورہ ضلع سیوان میں ایک مقدس جگہ ہے جہاں سلسلہ سہروردیہ کے مشہور بزرگ حضرت مخدوم سید حسن سہروردی پیر دریاؒ کی قبر مبارک اور خانقاہ ہے۔ اس خانقاہ سے سلسلہ سہروردیہ کو بہت فروغ ہوا۔ آپ ہی کے خسر حضرت میر عبدالمالک عسری ضلع سارن میں آرام فرما ہیں۔ یہ حضرت محمد عیسیٰ تاج جون پوریؒ کے مرید تھے ان کی خانقاہ میں سلسلہ چشتیہ کا فیضان جاری تھا۔
تاج پور بسہیا ضلع سارن میں حضرت حافظ بھیکن جلال منجھن ناصحی سارنیؒ مشہور بزرگ ہیں جو حضرت مخدوم شاہ دولت منیریؒ کے مرشد ہیں اور شہاب الدین قتال زاہدیؒ کے نواسے، آپ کی خانقاہ عظمت و شہرت کے اعتبار سے بہت نمایاں رہی ہے اور اس سے سلسلہ قادریہ، زاہدیہ، سہروردیہ، شطاریہ کا خاص فیضان ہوا ہے۔

حضرت ضیاءالدین صوفی جینڈھوسیؒ دسویں صدی ہجری کے سلسلہ سہروردیہ کے صاحب فیض وکرامت بزرگ ہیں۔ جنھوں نے رشد و ہدایت کا سلسلہ جینڈھوس میں خانقاہ بنا کر کیا۔ آپ حضرت مخدوم شاہ غریب اللہ حسین دھکمہ کوشؒ کے مرید و مجاز تھے۔ آپ کی خانقاہ میں شاہ عالم ثانی نے کافی جاگیریں نذر کی ہیں۔ یہ فرمان خانقاہ منیر شریف میں موجود ہے۔

حضرت سید محمد بندہ نواز گیسو درازؒ کی اولاد میں حضرت دیوان جعفر قادریؒ ہیں۔ جن کو حضرت میر فضل اللہ گوسائیںؒ کے سلسلے سے فیض ملا ہے اور آپ کے مرید و خلیفہ حضرت میر خلیل قطبی قادریؒ کے مرید و خلیفہ حضرت منعم پاکباز ہیں۔ آپ ہی کے توسط سے یہ فیوض اکثر خانقاہوں میں پہنچے۔ آپ کی خانقاہ باڑھ میں رشد و ہدایت اور فیوض و برکات کے لئے مشہور تھی۔

حضرت شاہ کبیرؒ کی خانقاہ کبیریہ سہسرام بھی رشد و ہدایت کے لیے کافی مشہور ہے۔ اس خانقاہ سے قادریہ سلسلہ کو فروغ ہوا۔ اس میں ایک عظیم الشان مدرسہ اور کتب خانہ بھی تھا اور اس کے لیے فرخ سیر نے بہت بڑی جاگیر پیش کی تھی۔

قلندریہ کے مشہور بزرگ حضرت مخدوم جمال الدین عرف جنتیؒ مرید و خلیفہ حضرت بدیع الدین مدارؒ کی خانقاہ ہلسہ ضلع نالندہ میں مشہور و معروف رہی ہے اور مزار مبارک کے کتبہ میں شاہ سمن کے ساتھ گورنر بہار دریا خاں مولانی خاص خیل کا نام درج ہے۔

اسلام پور کے متصل ایک گاؤں بیر بیگہ ہے۔ وہاں کے مشہور بزرگ حضرت شاہ قیام اصدقؒ ہیں ان کی خانقاہ علم و فضل اور رشد و ہدایت کے لیے بارہویں صدی ہجری میں بڑی مشہور تھی۔

عظیم آباد نہ صرف سیاسی عظمت کا حامل رہا ہے بلکہ بزرگان دین نے بھی یہاں آکر رشد و ہدایت کے فریضے انجام دیئے ہیں۔ حضرت شہاب الدین پیر جگ جوتؒ جو حضرت مخدوم جہاں کے نانا تھے اور شیخ شہاب الدین سہروردیؒ کے

مرید و خلیفہ ہیں، ان کے ذریعہ سلسلہ سہروردیہ کا فیضان جاری ہوا، لیکن ابھی تک تحقیق و جستجو کے باوجود ان کی خانقاہ کا پتا نہ چل سکا۔ البتہ حضرت آدم صوفیؒ ہیں جو حضرت بابا فریدالدین گنج شکرؒ کے مرید و خلیفہ کے صاحبزادے حضرت حمیدالدینؒ کی شادی حضرت مخدوم شہاب الدین پیر جگ جوتؒ کی چھوٹی صاحبزادی سے ہوئی اور ان کے فرزند ارجمند حضرت مخدوم یتیم اللہ سفید بازؒ ہیں۔ ان کی خانقاہ میں رشد و ہدایت کا درس دیا جاتا تھا۔ لیکن اس وقت ان دونوں خانقاہوں میں سجادگان کا کوئی تسلسل نظر نہیں آتا۔

دسویں صدی ہجری کے ایک مشہور بزرگ حضرت دیوان شاہ ارزانؒ ہیں جو سلسلہ قادریہ کے مشہور بزرگ ہیں۔ ان کی خانقاہ تکیہ شاہ ارزاں محلہ درگاہ پر، پٹنہ میں ہے۔ ان کے یہاں رشد و ہدایت کا سلسلہ ہے۔ لیکن تجرد کی زندگی صاحب سجادہ کے لیے ضروری ہے اور خلیفہ ہی سے آپ کی خانقاہ کی سجادگی چلتی ہے۔

سلسلہ سہروردیہ کے ایک مشہور بزرگ حضرت زین العابدین پیر دمڑیاؒ کی خانقاہ محلہ معروف گنج پٹنہ سیٹی میں واقع ہے۔ یہ خانقاہ دریا کے کنارے ہے اور فیوض و برکات کے لیے مشہور ہے۔

سلسلہ ابوالعلائیہ کا فیضان صوبہ بہار میں خاص اہمیت کا حامل ہے چنانچہ گیارہویں صدی ہجری میں حضرت مخدوم منعم پاک بازؒ کے رشد و ہدایت کا ستارہ عروج پر تھا۔ آپ کی خانقاہ میتن گھاٹ میں ہے۔ آپ کے خلفاء ہیں حضرت مخدوم حسن علیؒ، حضرت رکن الدین عشقؒ، حضرت غلام حسین منعمیؒ، حضرت صوفی دائم شاہؒ اور حضرت مولانا حسن رضاؒ بڑے مشہور و معروف ہوئے۔

حضرت رکن الدین عشقؒ کی خانقاہ تکیہ پٹنہ سیٹی میں ہے جو رشد و ہدایت کے اعتبار سے کافی مقبول ہوئی۔ اس کی ایک شاخ اعلیٰ حضرت میر قمرالدین حسینؒ کے واسطے سے داناپور بھی پہنچی۔ وہاں ایک مشہور بزرگ حضرت شاہ سجاد داناپوریؒ تھے۔

جن کی خانقاہ ابوالعلائیہ ہے۔ یہ خانقاہ علم و فضل کے اعتبار سے بہت ممتاز رہی ہے۔ اس کی ایک شاخ الہ آباد میں خانقاہ ابوالعلائیہ کے نام سے مشہور ہے۔

حضرت مخدوم حسن علیؒ کی خانقاہ خواجہ کلاں میں علم و فضل اور رشد و ہدایت کے لیے کافی مشہور و معروف رہی ہے۔ آپ کے خلفاء میں سے حضرت مخدوم یحییٰ علی نوآبادیؒ یکتائے روزگار تھے اور ان کی خانقاہ صفی پور میں ہے اور مشہور زمانہ رہی ہے۔ اس لیے کہ آپ کا فیض خانقاہ اسلام پور میں حضرت شاہ ولایت علی اسلام پوریؒ کو پہنچا ہے۔ خانقاہ شیخ پورہ میں حضرت شاہ جمال علی بلخیؒ کو اور ان کے واسطے سے حضرت جناب حضور شاہ امین احمد کو خانقاہ بہار شریف پہنچا۔ پچھرہ میں کریم چک ایک مشہور محلہ ہے۔ یہاں حضرت مخدوم حسن علیؒ کے مرید و خلیفہ حضرت حکیم فرحت اللہ حسن دوست کی خانقاہ ہے جو رشد و ہدایت کے اعتبار سے مشہور و معروف رہی۔ پھلواری شریف میں بھی آپ کے مرید و خلیفہ حضرت عبدالغنی اور عبدالمغنی کی خانقاہ اور مدرسہ بھی کافی شہرت کے حامل تھے۔

حضرت غلام حسین منعمیؒ کے پوتا حضرت شاہ عطا حسین منعمیؒ کی خانقاہ داناپور سے محلہ رام ساگر گیا منتقل ہوگئی۔ چونکہ آپ علم و فضل کے علاوہ تصنیف و تالیف میں مشہور زمانہ تھے۔ اس لیے آپ کی خانقاہ سے رشد و ہدایت کا سلسلہ کافی فروغ پایا۔

خسرو پور کے متصل ایک موضع صفی پور ہے۔ یہاں حضرت غوث پاک کی اولاد میں سے حضرت مخدوم صفیؒ تشریف لائے اور رشد و ہدایت کے لیے خانقاہ تعمیر کی۔ یہ خانقاہ بارہویں صدی ہجری تک مشہور و معروف تھی۔ لیکن اب خاموش ہے۔

گیا میں بیتھو شریف ایک مشہور جگہ ہے۔ یہاں حضرت مخدوم اشرف جہانگیر سمنانیؒ کے خلفاء میں سے ساتویں واسطے کے بعد حضرت مخدوم درویشؒ ہیں۔ ان کی خانقاہ بھی اپنی عظمت و جلالت کی وجہ سے مشہور و معروف رہی ہے۔

گیارہویں صدی ہجری میں حضرت عماد الدین قلندرؒ کی خانقاہ

سنگل تالاب پٹنہ سیٹی میں اپنی عظمت کے اعتبار سے بڑی ممتاز رہی ہے۔ اور خانقاہ عمادیہ کے نام سے مشہور ہے۔ لیکن حضرت پیر مجیب اللہؒ نے اور ان کی خانقاہ نے بارہویں صدی ہجری میں اہم دینی رول ادا کیے۔ آپ کی خانقاہ کا نام خانقاہ مجیبیہ ہے جو رشد و ہدایت اور مقبولیت خاص و عام کے لیے نمایاں اور ممتاز ہے۔ اور پھلواری شریف میں مرجع خلائق ہے۔ اس خانقاہ سے سلسلہ قادریہ کا فیضان بہت دُور دُور تک پہنچا۔ اگرچہ سلسلہ سہروردیہ اور چشتیہ کی بھی قوی نسبتیں ہیں۔ اس کی ایک شاخ پھلواری شریف ہی میں خانقاہ سلیمانیہ کے نام سے مشہور ہے۔

مختصر یہ کہ بہار کی خانقاہیں فیوض روحانی اور تعلیم دینی کے لیے بہت ممتاز رہی ہیں جس میں تصنیف و تالیف کے علاوہ اخوت و بھائی چارگی، انسانیت و مروت، حسنِ اخلاق کی تعلیم دی جاتی رہی اور یہ خانقاہیں تہذیبی اور سماجی اصلاح کے علاوہ آپس میں اتحاد و اتفاق کے لیے پیش پیش تھیں لیکن جب ملت پر زوال آیا تو یہ خانقاہیں بھی انحطاط کی طرف مائل ہونے لگیں۔ سجادہ نشیں گوشہ گیر اور خلوت نشیں ہو گئے اور ان مراکز سے زندگی کی روشنی پھوٹنی بند ہو گئی۔ پھر بھی وقتاً فوقتاً ان ہی خاکستروں میں کوئی دبی ہوئی چنگاری چمک اٹھتی ہے اور ان برسے ہوئے بادلوں کی خوابیدہ بجلیاں شب تار میں لہرانے لگتی ہیں۔

اُردو کی ابتدائی نشو و نما اور صوفیائے کرام کی خدمات

اُردو کی ابتدائی نشو و نما کا جہاں تک تعلق ہے یہ تسلیم کرنا ہی پڑے گا کہ اس کی آبیاری میں صوفیائے کرام کا بڑا ہاتھ ہے اور اُردو کے نقوش اوّلیں ان ہی صوفیائے کرام کے مرہون منت ہیں۔ دیارِ ہند میں صوفیائے کرام رشد و ہدایت، تزکیہ نفس، خلوص و محبت اور اخلاق و ایثار کے ذریعہ عوام کے دلوں پر فتح حاصل کر رہے تھے۔ وہ عوام کو وعظ و نصیحت بھی کرتے۔ ان کے پند و نصائح میں صداقت اور کشش ہوتی جو عوام کے دلوں پر نقش کر جاتے اور لوگوں کے دلوں میں گھر کر لیتے اور وہ گرویدہ ہو کر ان کے دامن سے وابستہ ہو جاتے۔ اسی طرح ان کے طور طریقے اور زبان پر بھی اثر پڑتا۔ یہی اسباب اُردو کی ابتدائی نشو و نما کے لیے سازگار رہوئے۔ ڈاکٹر اعجاز حسین نے اپنی تصنیف میں اس طرح روشنی ڈالی ہے:

> "جس وقت اُردو کی تخلیق ہو رہی تھی، ملک میں مذہبی فضا ہر شعبۂ زندگی پر حاوی تھی۔ سلطنت چاہے کسی کی رہی ہو مگر مذہب شہنشاہی کر رہا تھا۔ ہر طبقہ اس کے آگے سر جھکائے تھا۔ اس کی آنکھ سے دنیا کی ہر چیز دیکھی جا رہی تھی۔ اسلام مغرب اور مشرق کے اکثر گوشے چھان کر ہندوستان میں اپنا جھنڈا گاڑنے کی کوشش کر رہا تھا۔ مسلمان بادشاہوں نے تبلیغ اسلام کے لیے منظم انجمن یہاں قائم نہیں کی۔ فقراء اور علماء نے البتہ اشاعتِ اسلام میں کافی حصہ لیا۔ جہاں کہیں وہ پہنچ سکے، مذہب کی ترویج دل کھول کر کی اور اسی سلسلے میں اُردو کو بھی آگے بڑھنے کا موقع ہاتھ

آثار ہا۔ چنانچہ شمال یا جنوب جہاں بھی اُردو کی قدیم تصنیف یا تالیف دستیاب ہوئی ہے، وہ مذہب ہی کی آوردہ معلوم ہوتی ہے۔" [1]

دوسری وجہ اُردو کی نشو و نما کی یہ بھی ہے کہ صوفیائے کرام کی غرض و غایت رشد و ہدایت و تبلیغ اسلام تھی اس لیے ان کا تعلق خواص سے زیادہ عوام سے تھا۔ عوام تک رسائی کے لیے خدمت خلق کے ساتھ ساتھ ان کی زبان کا بھی جاننا ضروری تھا کیوں کہ وہ عوام ہی کی زبان میں تبلیغ اسلام کرتے اور ان کی زبان کو اپناتے۔ اس طرح عوام کی زبان کے الفاظ، جملے اور فقرے کی شکل میں زبان فیض ترجمان سے صادر ہوتے اور یہی بھاشا اور ان کی زبان کا اختلاط تھا تاکہ عوام زیادہ سے زیادہ ان کے ارشادات کو سمجھ سکیں اور ان کے فیوض و برکات سے فیضیاب ہو سکیں۔ اس لیے صوفیائے کرام نے مقامی بھاشا کو گلے لگایا اور یہی بھاشا آگے چل کر اُردو کی شکل میں جلوہ گر ہوئی۔

یہ بھی حقیقت ہے کہ اُردو ادب میں ہمیں صوفیت کی روایت ان بزرگان دین کے تربیتی فقرے اور اخلاقی دوہے وغیرہ میں ملتی ہے جو بھاشاؤں کے لباس میں ملفوظ ہے۔ اور انہیں اُردو کے نقوش اولیں کہا جاتا ہے۔ یہ فقرے زبان کی ارتقاء میں معاون ضرور رہے ہیں اور ان ہی میں کچھ صوفیانہ اور اخلاقی نکتے بھی مل جاتے ہیں۔ مثلاً حضرت بابا گنج شکر رحمۃ اللہ علیہ (۵۶۹ھ تا ۶۶۴ھ) کا یہ فقرہ قابل توجہ ہے کہ آپ کے مشہور مرید و خلیفہ حضرت جمال الدین ہانسوی رح تھے جن کی کنیز مادر مومناں کے نام سے مشہور تھیں۔ جب قطب جمال ہانسوی رح کا انتقال ہو گیا تو آپ کے چھوٹے صاحبزادے حضرت مولانا برہان الدین صوفی رح کو مع مصلّے و عصا حضرت فریدالدین گنج شکر رحمۃ اللہ علیہ کی خدمت میں لے گئیں

---

[1] مذہب اور شاعری: مصنف ڈاکٹر اعجاز حسین ص ۶۵

آپ نے حضرت برہان الدین صوفیؒ کو بیعت سے مشرف کر کے اسی مصلّی اور عصا کے ساتھ خلافت نامہ بھی عطا فرمایا اور آپ کو واپس کر دیا۔ اس وقت حضرت نظام الدین اولیاءؒ بھی موجود تھے۔ مادر مومناں نے یہ دیکھ کر حضرت فریدالدین گنج شکرؒ سے یہ عرض کیا کہ "خوجا بالا است"۔ آپ نے جواب میں فرمایا کہ "مادر مومناں پولون کا چاند بالا ہوتا ہے"۔ مراد یہ کہ بالا وہ ہے جو روحانی طور پر تاباں ہے جیسے پونم کا چاند ہوتا ہے۔[۱]

شمالی ہند میں صوبہ بہار کی بھی خاص اہمیت ہے۔ یہاں کے صوفیائے کرام نے بھی اُردو زبان و ادب کی آبیاری میں ابتدا ہی سے حصہ لیا ہے۔ چنانچہ صوبہ بہار کے عظیم المرتبت صوفی بزرگ حضرت مخدوم جہاں شیخ شرف الدین یحییٰ منیریؒ کے مقولے، دوہرے، کنج منڈرے، فالنامے وغیرہ مشہور ہیں اور اس میں تصوف کے نکات بھی ہیں۔ آپ کے ملفوظ معدن المعانی میں وہ جوابی ٹکڑا[۲] "دیس بھلا پر دور" ایک مرید کے مقولے "باٹ بھلی پر سانکری" کا جواب تھا۔ یہ فقرہ اس طرح ہے: "باٹ بھلی پر سانکری دیس بھلا پر دور"۔ یعنی راستہ (راہ سلوک) تو اچھا ہے لیکن تنگ (دشوار گذار)۔ دوسرے فقرے کا مفہوم یہ ہے کہ دیس (منزل مقصود) بہتر تو ہے لیکن بہت دور ہے۔ اس کے علاوہ فالنامے مخدوم جہاں مخطوطہ سنہ ۱۰۹۷ھ میں بھی تصوف کے نکات ملتے ہیں۔ آپ کے مرید و جانشیں حضرت مولانا مظفر بلخیؒ (متوفی سنہ ۸۰۳ھ) کے مکاتیب میں بھی مختلف دوہے ملتے ہیں۔

حضرت مخدوم جہاں کے خالہ زاد بھائی حضرت مخدوم احمد چرم پوشؒ (متوفی سنہ ۷۷۶ھ) سلسلہ سہروردیہ کے مشہور بزرگ ہیں۔ آپ فارسی کے صوفی شاعر بھی تھے۔ آپ کا ایک ہندی دوہا ضیاء القلوب میں موجود ہے۔ آپ

---

[۱] سیر الاولیاء : سید مبارک بمعروف امیر خورد صـ ۱۸۴ - ۱۸۳

[۲] معدن المعانی : حضرت شیخ شرف الدین یحییٰ منیریؒ صـ ۲۰۳

زاہد و پارسا کا فرق بتاتے ہوئے فرماتے ہیں:

بیتا من نمونیہ شرونی کہا ہوئے
اہیں بید بھا بید مان سر نہ کینی کوئے [۱]

مونس القلوب از حضرت احمد لنگر دریا بلخیؒ (سنہ ۸۲۶ھ تا سنہ ۸۹۱ھ) میں ہے کہ جس رات حضرت مخدوم جہاں قدس سرہٗ نے انتقال فرمایا۔ اسی رات مولانا مظفر بلخیؒ نے خواب میں دیکھا کہ حضرت مخدوم جہاں یہ دوہا پڑھ رہے ہیں:

آئی رات سہانیاں
جن کارن دھکا کھائیاں

یعنی وہ سہانی رات آگئی جس کے لیے میں نے اتنے دھکے کھائے۔

حضرت مخدوم جہانیاں جہاں گشتؒ (سنہ ۷۰۷ھ تا سنہ ۷۸۵ھ)۔ آپ حضرت بہاء الدین زکریا ملتانیؒ کے پوتے حضرت رکن الدینؒ کے مرید و خلیفہ تھے۔ آپ کا ایک ہندی مقولہ حضرت قاضی علا شطاریؒ (متوفی سنہ ۹۰۱ھ) کے ملفوظ معدن الاسرار میں درج ہے۔ اس سلسلے میں ایک واقعہ ہے کہ کسی نے مخدوم جہانیاں جہاں گشتؒ سے پوچھا کہ یہ کیا بات ہے کہ وہی اوراد و اعمال ہیں جو وہ بھی پڑھتا اور کرتا ہے جو خود حضرت مخدوم جہانیاںؒ پڑھتے اور کرتے ہیں۔ لیکن اس کا کوئی اثر مرتب نہیں ہوتا۔ اس کی کیا وجہ ہے؟ اس پر حضرت مخدوم جہانیاںؒ نے جواب دیا۔ "کھندا ہے پھندا کہاں" اس کا مطلب یہ معلوم ہوتا ہے کہ گڈھا تو ہے اور اس میں مچھلیاں بھی ہیں لیکن جال نہیں ہے۔ یعنی تزکیۂ نفس اور جذب صادق وصول الی اللہ کے لیے ضروری ہے۔

بزرگوں کے اس قسم کے بہت سے اقوال جو ہندی دوہوں اور صاف کھڑی بولی کے فقروں پر مشتمل ہیں۔ ان کے ملفوظ و مکاتیب میں موجود ہیں۔ جیسے

۱؎ ضیاء القلوب، ملفوظ حضرت سید احمد چرم پوشؒ

لطائف اشرفی ملفوظ حضرت اشرف جہانگیر سمنانیؒ میں حضرت عبدالقدوس گنگوہیؒ کے مکاتیب میں متعدد ہندی فقرے ہیں اور ان کی کتاب مرشد نامہ میں تو ایسے ہندی راگوں کی طرز پر ان کی زبان مبارک سے متعدد فقرے ادا ہوئے ہیں۔ یہ سب چیزیں ہندوستان کی ایک مشترک زبان کی نشو ونما کی نشان دہی کر رہی ہیں اور یہ دلیل قطعی اس بات کی ہے کہ تبلیغ و اشاعت اور باہمی میل جول کی فضا تیار کرنے کے لیے ان بزرگوں نے بہت اہم کردار ادا کیا ہے۔ لیکن یہ فقرے منتشر اور غیر مربوط ہیں۔ بعض بزرگوں نے تو چھوٹے چھوٹے رسالے نظم و نثر میں لکھ ڈالے تاکہ دین کی ضروری باتیں اور تصوف کے نکات عوام کے ذہن نشین ہو جائیں۔ بعض صوفیوں نے مذہبی رسالے لکھے ہیں۔ جن میں اسلامی صوفیانہ تربیت کے نکتے ملتے ہیں یا اسلامی عقائد پیش کیے گئے ہیں۔ یہ رسالے مربوط نثر میں ہیں۔ حکیم شمس اللہ قادری نے اپنی تصنیف میں شیخ عین الدین گنج العلم (متوفی ۷۹۵ھ) کے رسالہ کو اردو نثر کا سب سے پہلا کارنامہ ثابت کرنے کی کوشش کی ہے اور ان ہی کی ہم نوائی ڈاکٹر سید محی الدین قادری زور نے بھی کی ہے[۱]۔ لیکن حامد حسن قادری نے اپنی تصنیف میں اردو نثر کی پہلی تصنیف حضرت مخدوم سید اشرف سمنانیؒ (۶۸۸ھ تا ۸۰۸ھ) کے ایک اردو رسالہ کو قرار دیا ہے جو ۷۵۸ھ میں تصوف اور اخلاق پر لکھا گیا ہے۔

حضرت مخدوم جہانیاں جہاں گشتؒ کے چھوٹے بھائی حضرت سید صدر الدین راجو قتالؒ کے بھی ایک رسالہ کا پتہ چلتا ہے جو رسالہ حضرت شاہ راجو کے نام سے منسوب ہے۔ اس میں بھی عقائد اور تصوف کے نکات درج ہیں۔ اس کے علاوہ کچھ اور چیزیں بھی ہیں جو صوفیائے کرام کے نام سے منسوب ہیں۔ شمالی ہندوستان کے علاوہ جنوبی ہندوستان خصوصیت کے ساتھ دکن اور

---

[۱] اردو شہ پارے حصہ اول ص ۱۹ مصنفہ محی الدین قادری زور

گجرات بھی اُردو کے بڑے مرکز سمجھے جاتے ہیں اور یہاں بھی صوفیائے کرام کی بدولت یہ نئی زبان پھولی پھلی اور پروان چڑھی۔ جب محمد تغلق نے دیوگیری کو دولت آباد بنا کر اپنا دارالسلطنت قرار دیا اور علماء صوفیا اور ادبا و شعراء کو دہلی سے دیوگیری منتقل ہونے پر مجبور کیا تو نئی مشترک زبان بھی ان کے ساتھ ساتھ دکن میں داخل ہوئی اور سلاطین بیجاپور اور گول کنڈہ نے اپنے عہد میں ان کی ترقی و اشاعت میں اہم کارنامے انجام دئیے۔ یہ بھی حقیقت ہے کہ ان بزرگان دین کے فیوض کے بغیر وہ مشترکہ زبان جو ہندوؤں اور مسلمانوں کے باہمی میل جول اور بول چال کا نتیجہ تھی پروان نہیں چڑھ سکتی تھی۔ چنانچہ دکن میں باقاعدہ طور پر صوفیانہ رنگ کی تصنیفیں شروع ہوئیں جو پہلے فارسی میں ہوا کرتی تھیں۔

حضرت سید محمد بندہ نواز گیسو درازؒ (۷۲۰ھ تا ۸۲۵ھ) مرید و جانشین حضرت نصیر الدین چراغ دہلویؒ نے رشد و ہدایت کے لیے فارسی میں مختلف عربی رسائل کے ترجمے کیے۔ اس کے علاوہ تصوف میں بھی بعض رسالے دکنی اُردو میں تصنیف فرمائے۔ جن میں معراج العاشقین بہت مشہور ہے۔ جو تصوف کے نکات اور اصطلاحات کی توضیح و تشریح پر مشتمل ہے۔ اس رسالہ میں وہ تمام اصول و ضوابط بتائے ہیں۔ جن پر عمل کرنے سے سالک مقام ذات تک پہنچ جاتا ہے[۱]۔ یہ رسالہ بیس صفحات کا ایک مختصر رسالہ ہے جو ۸۰۲ھ تا ۸۲۵ھ میں تصنیف ہوا۔ اس میں دکنی زبان کا زیادہ اثر ہے۔ اور چونکہ اُردو کے بالکل ابتدائی دور میں لکھا گیا ہے اس لیے اس میں بہت کچھ خامیاں بھی نظر آتی ہیں۔ اس کے علاوہ بھی آپ نے دو اور چھوٹے چھوٹے رسالوں کے ذریعہ عوام کو رشد و ہدایت کی تعلیم کی ہے۔ اس کا سلسلہ ان کے بعد بھی قائم رہا۔ آپ کے بعد آپ کے صاحبزادے اکبر حسینی (۷۶۳ھ تا ۸۲۳ھ) نے نشاط العشق تصنیف حضرت عبدالقادر جیلانیؓ کا ترجمہ اُردو میں کیا تھا۔

---

[۱] معراج العاشقین صد ۲۵ مرتبہ: خلیق انجم

شاہ داؤد نے بھی چودہ اوراق کا ایک رسالہ کشیف الوجود لکھا جس کا موضوع تصوف ہے۔ بہاء الدین باجن نے (۸۵۵ھ تا ۹۵۲ھ) بھی اپنے مرشد کے ملفوظات اور ارشادات جمع کیے ہیں، جس کا نام خزانہ رحمت رکھا۔ شاہ قلندر جو شاہ ہداللہ حسینی کے مرید تھے۔ انہوں نے رسالہ شاہ قلندر کے نام سے ایک رسالہ لکھا۔ جس کی عبارت مسجع و مقفیٰ ہے لیکن اس کے ابتدائی نمونے ہیں۔ اس سے یہ بھی پتہ چلتا ہے کہ مُلّا وجہی کے پیش نظر اس تصنیف کے نمونے رہوں گے۔

مذکورہ بالا حقائق سے یہ معلوم ہوتا ہے کہ ان صوفیائے کرام نے رشد و ہدایت کے لیے تصوف کے رموز و اسرار کی وضاحت کو اُردو زبان میں زیادہ موزوں اور مناسب سمجھا اور اس پر اپنی تصنیف و تالیف کی عمارت کھڑی کی۔ یہ وہ ذوق و شوق تھا جو بڑھتا ہی گیا۔ آٹھویں صدی کے بعد نویں صدی ہجری میں بھی صوفیائے کرام اس خدمت پر نظر آتے ہیں۔ عادل شاہی حکمرانوں نے بھی تقریباً دو سو برس تک اس کی آبیاری کی اور علم و ادب کی سرپرستی کی۔ دو سو سال میں بیجاپور میں اُردو کے کئی مشہور شاعر اور مصنف گذرے ہیں۔ جن میں شمس العشاق میراں جی، برہان الدین جانم اور شاہ امین الدین اعلیٰ مشہور و معروف ہیں۔ شاہ میراں جی متوفی ۹۰۲ھ کی نثر میں کئی تصانیف ہیں۔ جس میں شرح مرغوب القلوب، گلباس اور جل ترنگ بیان تصوف میں مشہور رہیں۔ وجیہہ الدین علوی گجراتی (۹۱۱ھ تا ۹۹۸ھ) کی تصنیف تاج الحقائق اور بحر الرائق مشہور ہیں۔ شاہ علی محمد جیو گام دھنی کی تصنیف بھی پائی جاتی ہے۔ دسویں صدی ہجری میں شاہ برہان الدین جانم نے تصوف و سلوک میں متعدد رسائل تالیف کیے جن میں توحید و تصوف کے مسائل ہیں۔ معرفت القلوب ان کی مشہور تصنیف ہے جس میں سادگی کے ساتھ ساتھ شاعرانہ لطافت بھی ہے۔ شاہ امین الدین اعلیٰ کی تصانیف گنج مخفی، نکاتِ معرفت اور گفتار شاہ امین مشہور رہیں۔ جن میں تصوف کے بعض مسائل اور بعض اصطلاحات کی تشریح کی گئی ہے۔ حضرت امین الدین اعلیٰ کے خلفا نے بھی اس سلسلے کو جاری رکھا۔ چنانچہ

ان میں مولانا عبداللہ نے احکام الصلوٰۃ، میراں جی خدانما نے شرح تمہید، شاہ میراں حسینی نے خلاصۃ الرویا، میراں یعقوب نے شمائل الاتقیا، برہان الدین قادری نے رسالہ وجودیہ، حبیب اللہ قادری نے تحفۃ المرسلہ اور ولی اللہ قادری نے معرفۃ السلوک لکھے ہیں۔ اس کے علاوہ بھی مشہور صوفیانہ تصانیف کا ترجمہ کیا گیا۔

اس عہد میں صوبہ بہار میں عماد الدین قلندر پھلواروی ۱۰۸۱ھ سے ایک رسالہ منسوب کیا جاتا ہے جس کا نام سیدھا راستہ یا صراط مستقیم ہے۔ ظہور الحق ظہو نے بھی مختلف رسائل تصنیف کیے ہیں جن میں فیض عام اور کسب النبی کی اہمیت ہے اس کے علاوہ بھی علمائے صادق پور نے مذہبی رسائل کے ذریعہ رشد و ہدایت کی ترویج و اشاعت کی۔ حضرت پیر دمڑیا اور ان کے سجادگان و خلفاء نے بھی اردو میں چھوٹے چھوٹے رسالے تصنیف کیے جن کے ذریعہ اخلاق و تصوف کی تعلیم دی گئی ہے۔ حضرت نقی بلخی نے بھی مذہبی رسالہ الاحکام لکھا۔ یہاں بھی یہ رجحان ترقی پذیر رہا اور اردو نثر میں مختلف کتابیں تصوف اور تذکرہ مشائخ میں لکھی گئیں۔ شمالی ہند میں بھی فضلی کی کربل کتھا یا دہ مجلس کو اہمیت حاصل رہی ان کے علاوہ بھی اس موضوع پر کئی کتابیں لکھی گئیں۔ مختصر یہ کہ اس دور کی نثری تصانیف مذہبی اور صوفیانہ ہیں۔ کیونکہ ان کے لکھنے والے علماء تھے یا صوفیاء۔ انہوں نے مذہب کے خشک مسئلوں اور ٹھوس اصولوں کو بھی ادبی رنگینیاں بخشیں اور ان صوفیانہ خیالات کے ذریعہ ہندوستانی عوام کی ذہنی اور باطنی اصلاح کی ہر ممکن کوشش کی اور اس کے ذریعہ تزکیۂ نفس کا کام کیا۔ ان بزرگوں نے اپنی تحریروں میں فنی اور جمالیاتی قدروں سے زیادہ اخلاقی اصلاحی اور صوفیانہ قدروں کو پیش نظر رکھا ہے۔

تمثیل نگاری

تمثیل نگاری نے ادب میں ایک اہم مقام حاصل کر لیا ہے کیونکہ بعض حقیقتیں صاف صاف بیان کرنے سے وہ اثر نہیں رکھتیں جو تمثیل کے پیرائے میں اثر پذیر ہوتی ہیں۔ انسان اس سے متاثر بھی ہوتا ہے اور کیف آگیں بھی تصوف کے بعض نکات ایسے بھی ہوتے ہیں جو صاف صاف

بیان نہیں کیے جا سکتے ان کو کنایوں اور اشاروں میں بیان کیا جاتا ہے۔ تمثیل اس کے لیے بہت زیادہ کارآمد ہے۔ چنانچہ اُردو میں بندہ نواز گیسو درازؒ کا شکار نامہ تمثیلی پیرایہ میں ہے اور دوسرا رسالہ تمثیل نامہ بھی ہے۔ اس میں تمثیل کے ذریعہ خدا کی حقیقت سمجھائی گئی ہے۔[۱] حضرت میران جی شمس العشاق کے رسالہ جل ترنگ اور گلباس بھی تمثیلی انداز میں ہیں۔ ان رسالوں میں مصنف نے تصوف کے آثار و نکات تمثیل کے پیرائے میں بیان کیے ہیں۔

گیارہویں صدی ہجری میں اُردو کی پہلی مکمل تمثیل وجہی کی سب رس ہے۔ جو فتاحی نیشاپوری کی نثری تلخیص قصۂ حسن و دل سے ماخوذ ہے۔ اس میں تصوف کے مراحل اور عشق کے واردات کو تمثیل کے ذریعہ ظاہر کیا گیا ہے۔ اس کے کردار مجرد صفات ہیں۔ بظاہر یہ ایک دلچسپ داستان ہے لیکن حقیقت میں تصوف کے رازہائے سربستہ کو دلکش انداز میں ظاہر کیا گیا ہے۔ وجہی نے جس اسلوب کو پروان چڑھایا وہ ان کے بعد بھی قائم رہا اور بتدریج داستان قصّے اور نظموں میں تمثیل کا استعمال ہوتا رہا۔ سب رس کے بعد بھی اسی رنگ کی دوسری تصنیف رجب علی بیگ سرور کی گلزار سرور ہے۔ جو ملا محمد رضی تبریزی کی فارسی نثر حدائق العشاق کا ترجمہ ہے۔ گلزار سرور کے بعد تمثیلی کہانی میں طلسم حیرت کا نام قابل توجہ ہے جسے جعفر علی خاں شیون نے ۱۸۷۲ء میں ترتیب دیا۔ بوستانِ خیال بھی ایک تمثیلی رنگ میں ہے۔ آخر میں یہ کہوں گا کہ راحت روح مصنفہ حضرت صوفی منیریؒ بھی تمثیل نگاری کی شاہکار ہے۔

---

[۱] اُردوئے قدیم ص۱۱۶ مصنفہ شمس اللہ قادری

اُردو میں صوفیانہ شاعری

اُردو ادب میں صوفیت کی دوسری روایت شاعری میں ملتی ہے ۔ اس میں بعض ایسے شاعر ہیں جو خود صاحب تجربہ صوفی گذرے ہیں یعنی جو باعمل اور بالذات بھی صوفی تھے ۔ ان کا مسلک و مشرب صوفیانہ تھا ۔ اور اسی فضا میں سانس لے رہے تھے ۔ انہوں نے اپنے تجربات اخلاقی، روحانی اور عرفانی کو شعریت بخشی اس لیے ان کے اشعار میں ان کے صوفیانہ خیالات کی جلوہ گری ہے اور بعض ایسے شعراء تھے جو صوفی تو نہ تھے مگر علمی اور فنی طور پر صوفیانہ موضوعات و نکات پر اشعار قلم بند کرتے تھے ۔ وہ شعراء جو باقاعدہ صوفی تھے ان میں سب سے پہلے حضرت بابا فرید گنج شکر کا نام لیا جاتا ہے اس لیے کہ مولوی عبدالحق صاحب نے اپنی تصنیف اُردو کی ابتدائی نشو و نما میں صوفیائے کرام کا کام میں ایک غزل ان سے منسوب کر کے نقل کیا ہے وہ یہ ہے ؎

وقتِ سحر وقتِ مناجات ہے	خیز دراں وقت کہ برکات ہے
نفس مبادا کہ بگوید ترا	خسپ چہ خیزی کہ ابھی رات ہے
با تنِ تنہا کہ روئے زیر خاک	نیک عمل کن کہ وہی سات ہے
پند شکر گنج بہ دل و جاں شنو	ضائع مکن عمر کہ ہیہات ہے

حضرت بو علی شاہ قلندر پانی پتی کے نام سے ایک دوہا بہت مشہور ہے ؎

سجن سکارے جائیں گے اور نین مریں گے روئے
بدھنا ایسی رین کرو کہ بھور کبھو نہ ہوئے

حضرت امیر خسرو دہلوی (۶۵۳ھ تا ۷۲۵ھ) آپ حضرت نظام الدین اولیاء کے چہیتے مریدوں میں تھے ۔ آپ نے ہندی میں دوہے اور غزلیں کہی ہیں ۔ افسوس

یہ ہے کسان کا ہندوی کلام ابھی تک ثقہ طور پر تحقیق کی روشنی میں نہیں آسکا ہے۔ آپ کے
فارسی دیوان غرۃ الکمال کے دیباچہ سے اتنا پتہ چلتا ہے کہ آپ نے ہندی میں بھی
بہت کچھ کہا ہے[1]۔ ایک مشہور غزل فارسی اور ریختہ کی ہے جس کے ہر شعر کا پہلا مصرع
فارسی تو دوسرا مصرع ریختہ میں ہے، آپ کی طرف منسوب ہے۔ اس کے دو اشعار
ملاحظہ ہوں ؎

زحالِ مسکیں مکن تغافل درائے نیناں بنائے بتیاں
کہ تاب ہجراں ندارم اے جاں نہ لیہو کاہے لگائے چھتیاں
شبان ہجراں دراز چوں زلف و روز وصلش چوں عمر کوتاہ
سکھی پیا کو جو میں نہ دیکھوں تو کیسے کاٹوں اندھیری رتیاں

حضرت امیر خسرو کے دو دوہے بھی پیش خدمت ہیں ؎

گوری سوئے سیج پر مکھ پر ڈارے کیس
چل خسرو گھر آپنے کہ سانجھ بھئی چودیس

دہ گئے بالم وہ گئے ندیا کنار
آپے پار اُتر گئے ہم تو رہے اروار

حضرت امیر خسرو چوں کہ صوفی مشرب ادیب و شاعر تھے اس لیے ان
کے ادب و شعر میں تصوف کی عکاسی ہے۔ وہ فارسی شعر و ادب کے تو عظیم المرتبت
صوفی شاعر ہیں۔ البتہ ریختہ یا اُردو میں ان کے شہ پارے خاطر خواہ دستیاب
نہ ہو سکے ہیں۔ اس لیے ان کے متعلق کوئی یقینی بات نہیں کہی جا سکتی لیکن یہ
بات قرین قیاس ہے کہ ریختہ میں بھی تصوف کے خیالات پیش کیے ہوں گے

حضرت مخدوم جہاں شیخ شرف الدین یحییٰ منیریؒ (۶۶۱ تا ۷۸۲ھ)

---

[1] دیباچہ غرۃ الکمال ص ۶۶

سلسلہ فردوسیہ کے با فیض عظیم المرتبت بزرگ ہیں ان سے بھی ریختہ میں فالنامے، کہہ مندرے اور دوہے منسوب ہیں۔ جس میں تصوف کے نکتے ملتے ہیں۔

حضرت مخدوم جہاںؒ کے مرید و جانشیں حضرت مولانا مظفر بلخیؒ (المتوفی ۸۰۳ھ) کے فارسی مکاتیب میں بھی آٹھ دوہے ملتے ہیں۔ حضرت مخدوم جہاں کے خالہ زاد بھائی حضرت مخدوم سید احمد چرم پوش سہروردیؒ (المتوفی ۷۷۶ھ) فارسی کے صوفی شاعر تھے۔ اور "ضیاء القلوب" میں ان کے بھی دوہے مذکور ہیں۔

مذکورہ بالا حقائق پیش کرنے سے یہ حقیقت واضح ہوگئی کہ اُردو کی ابتدائی نشو و نما میں شمالی ہند کو تقدم اور تفوق حاصل ہے۔ اس لیے کہ پنجاب، دہلی، بہار میں بزرگانِ دین کے تربیتی فقرے، دوہے، کہہ مندرے وغیرہم عہد قدیم کے یعنی ساتویں اور آٹھویں صدی ہجری کے دستیاب ہوئے ہیں۔ البتہ اردو شاعری کے ارتقاء کا کوئی مربوط اور مسلسل خاکہ پیش کرنا مشکل ہے۔ لیکن گجرات اور دکن میں نویں صدی ہجری میں باضابطہ طور پر تسلسل کے ساتھ اُردو ادب و شعر کی روایت ملتی ہے اور نویں صدی ہجری میں تو دکن اور گجرات کے صوفیائے کرام نے مختصر رسالے بھی لکھے اور اپنی شاعری یعنی نظموں میں بھی صوفیانہ خیالات پیش کیے۔ چنانچہ ڈاکٹر وحید اختر اپنی تصنیف میں اس طرح رقم طراز ہیں:۔

> "گجرات کا علاقہ محمود غزنوی کے زمانے سے ہی مسلمانوں کے اثر میں آچکا تھا، دہلی سلطنت کے زمانے میں صوفیا نے یہاں اپنی خانقاہیں قائم کیں اور عام لوگوں میں رشد و ہدایت کا سلسلہ شروع کیا۔ ان میں سے اکثر نے ابتدائی اردو کی ایک بولی گجری کو اظہار خیال کا وسیلہ بنایا، یہ حضرات عام بول چال میں گجری کا استعمال کرتے تھے، ان کے بہت سے جملے اور اقوال مولوی عبد الحق نے "اردو کی ابتدائی نشو و نما میں صوفیائے کرام کے کام" میں نقل کیے ہیں، ان ہی میں سے بعض بزرگوں نے شاعری کے لیے بھی اسی زبان کا

انتخاب کیا کیوں کہ شاعری کا بنیادی محرک بھی تصوف ہی تھا۔ زبان اور تحریر دونوں سے تصوف کی تعلیمات کو عوام کے دلوں میں ہی جاگزیں کرنا مقصود تھا اور عوام میں قربت کا بہترین ذریعہ یہی تھا کہ بول چال کی زبان کو اختیار کیا جائے۔ دکن کے دوسرے علاقوں میں خصوصاً بیجاپور کے کئی شاعروں نے بھی اپنی زبان کو گجری کہا ہے، اس لیے یہ سمجھنا غلط نہ ہوگا کہ سب سے پہلے یہی بول چال اُردو شاعری کی زبان بنی۔ گجرات کے علاقے میں قادری، چشتی، جنیدی، شطاری، مغربی، عیدروسی رفاعی، سہروردی، نقشبندی، نوربخشی، خانوادوں کے صوفیا مختلف مقامات پر پھیلے ہوئے تھے۔ ان ہی کے تحریری کارناموں نے اُردو ادب کی داغ بیل ڈالی۔ ان میں شیخ علی جیو گام دھنیؒ، قاضی محمود دریائیؒ، بہاؤالدین باجنؒ، خوب محمد چشتیؒ وغیرہ کے نام تاریخی اہمیت کے حامل ہیں۔[1]"

گجرات کے سب سے پہلے اہم شاعر بہاؤالدین باجنؒ ہیں۔ جنھوں نے دوہے کے علاوہ نظمیں بھی کہی ہیں جن میں تصوف کی روشنی ملتی ہے۔ دوسرے بزرگ حضرت شاہ علی محمد جیو گام دھنیؒ کے یہاں طویل صوفیانہ مثنوی ملتی ہے جس میں توحید، معرفت اور بالخصوص ہمہ اوست کے مسلک کو شاعرانہ انداز میں پیش کیا ہے۔ قاضی محمود دریائیؒ نے بھی عشقِ حقیقی کا راگ چھیڑا۔ گجرات کے مشہور بزرگ خوب محمد چشتیؒ کی مشہور صوفیانہ مثنوی خوب ترنگ کو شاعرانہ عظمت حاصل ہے۔

دکن بھی تہذیب و ادب کا گہوارہ رہا ہے۔ چنانچہ سلاطین ہند میں سے علاءالدین خلجی اور محمد تغلق کے دورِ حکومت میں صوفیائے کرام کی آمد نے دکن میں نہ صرف رشد و ہدایت کی بلکہ اس کی تہذیب و تمدن کو بھی سنوارا اور نکھارا۔ حقیقت یہ ہے کہ علاءالدین

---

[1] خواجہ میر درد تصوف اور شاعری ص ۲۹۱ مصنفہ ڈاکٹر وحید اختر

خلجی کے عہد میں صوفیائے کرام کی آمد دکن میں ہوئی جنھوں نے رشد و ہدایت کا سلسلہ قائم کیا اور اخوت و بھائی چارگی کا ایسا درس لوگوں کو دیا کہ عوام و خواص دونوں ہی ان سے قریب ہونے لگے اور تبلیغ اسلام اور توسیع سلسلہ کا کام تیزی کے ساتھ ہونے لگا۔ حسنِ اتفاق سے سلطان محمد تغلق نے اپنا دارالسلطنت دہلی سے دیوگیری منتقل کرلیا تو اس کے ساتھ ہی ساتھ علمائے کرام اور صوفیائے عظام بھی دکن پہنچے۔ صوفیائے کرام کا طبقہ تو وہاں اپنے مشن میں سرگرم عمل رہا اور شعروادب کو بھی ذریعۂ اظہار بنایا۔ بیجاپور اور گولکنڈہ کے سلاطین نے بھی علم وادب کی سرپرستی کی اور وہ خود بھی صاحب ذوق شاعر تھے۔ لیکن صوفیائے کرام میں بیجاپور کے تین صوفی خانوادوں نے عوام کے دلوں پر گہرے نقوش ثبت کیے ہیں۔ ڈاکٹر وحید اختر لکھتے ہیں :۔

"بیجاپور کے صوفیا میں تین خانوادوں نے عام زندگی پر گہرے نقوش چھوڑے ہیں۔ ایک تو شیخ عین الدین گنج العلمؒ کے مریدوں کا سلسلہ ہے، دوسرا خواجہ گیسو درازؒ کے خلفاء کا سلسلہ اور تیسرا میران جی شمس العشاق کا سلسلہ۔ ایک اور سلسلہ کا آغاز شاہ صبغت اللہ سے ہوا۔ اس طرح بیجاپور، گجرات، بیدر، گلبرگہ، شمالی ہند، ایران اور عرب کے مختلف عناصر کی آماج گاہ بن کر ادب کا قبلہ بن گیا۔ تصوف کا اثر عام زندگی پر اتنا مضبوط تھا کہ اس عہد کا وہ شعرا بھی جو صاحبِ معرفت نہیں کہلائے جاسکتے، کسی نہ کسی طرح تصوف کا رنگ قبول کرنے پر مجبور رہے۔ اس طرح اس دور میں بھی تصوف ہی ادب و شعر کا سب سے اہم موضوع رہا یا پھر دوسری خالص شاعرانہ اور ادبی تخلیقات کے لیے بالواسطہ محرک کا کام دیتا رہا۔"[۱]

بیجاپور کے صوفیا میں حضرت شاہ میران جی شمس العشاقؒ کی مثنویاں خوش نامہ

---

[۱] خواجہ میر درد : تصوف اور شاعری ص ۲۹۶

خوش نغز، شہادت الحقیقت اور مغز مرغوب ہیں۔ یہ تمام مثنویاں صوفیانہ حقائق اور رموز معرفت کے موضوع پر ہیں۔ حضرت کے صاجزادے حضرت برہان الدین جانم رح کی مثنوی ارشاد نامہ میں بھی صوفیانہ حقائق کی جلوہ گری ہے۔ آپ کے صاجزادے حضرت امین الدین اعلیٰ رح کے کلام بھی رموز معرفت پر مبنی ہیں۔ ان بزرگوں کے بعد ایک اور صوفی شاعر شہباز حسینی رح بھی گذرے ہیں۔ جن کی ایک دو غزلیں بھی ملتی ہیں۔ عاشقؔ دکنی نے بھی تصوف کے مسائل کو اپنی نظم میں پیش کیا ہے۔ شاہ ابوالحسن قادری رح نے بھی ایک مثنوی "سکھ انجن" لکھی ہے جو صوفیانہ خیالات پر مشتمل ہے۔ قاضی محمود بحری نے بھی "من لگن" نام کی ایک صوفیانہ مثنوی لکھی ہے۔

گول کنڈہ کے سلاطین اور شعرا نے اُردو شاعری کی لَو کو اور تیز کیا۔ بالخصوص ابراہیم قطب شاہ اور محمد قلی قطب شاہ جیسے ادب نواز اور شعرا پرور بادشاہوں کی سرپرستی نصیب ہوئی تو ادب و شعر کے رجحان کو اور مقبولیت حاصل ہوئی۔ محمد قلی قطب شاہ خود بھی شاعر تھا اور اُردو کا سب سے پہلا صاحب دیوان شاعر ہے۔ اس کے کلام میں درد و عشق کی چاشنی کے ساتھ ساتھ تصوف کی بھی جلوہ گری ہے۔ اس کے عہد کے شعرا میں ملا وجہی کی شہرت اور مقبولیت زیادہ ہوئی۔ غواصی نے بھی اپنی مثنوی "طوطی نامہ" میں صوفیانہ خیالات پیش کیے۔ ابن نشاطی نے "پھول بن" جیسی مثنوی لکھی لیکن شاہ راجو کی عظمت صوفی اور شاعر دونوں اعتبار سے تھی۔ غرض کہ گول کنڈہ اور بیجا پور میں اُردو شاعری کی آبیاری اور سرپرستی بڑی شان و شوکت سے ہوئی اور عوام و خواص دونوں اس سے متاثر ہوئے۔

مذکورہ بالا حقائق کے تجزیئے سے یہ حقیقت واضح ہو جاتی ہے کہ اُردو کی ابتدائی نشو ونما ریختہ میں ہوئی اور سب سے پہلے صوفیائے کرام کے تربیتی فقرے، دوہے اور گنج منددرے اُردو کے نقوش اوّلیں ہیں جن میں صوفیانہ اسرار و رموز ہیں۔ شمالی ہند میں پنجاب، دہلی، بہار اور یوپی کو یہ فخر حاصل ہے کہ اُردو کی تشکیل اور ترویج میں انہیں تقدم اور تفوق حاصل ہے۔ لیکن اُردو نثر کے مختصر اور صوفیانہ رسالے اور اُردو

شاعری بالخصوص مثنوی نگاری میں صوفیائے دکن اور گجرات کو تقدم اور تفاخر حاصل ہے۔ اس لیے کہ شمالی ہند میں نویں اور دسویں صدی ہجری میں مستند طور پر کوئی ایسی تحریر دستیاب نہیں بلکہ جنوبی ہند میں اس کی ارتقائی کیفیت نظر آتی ہے۔ اردو شاعری میں خصوصاً مثنویوں میں شعراء نے تصوف کے حقائق و معارف کو ضرور پیش کیا ہے لیکن ان میں تصوف کی ایسی رنگا رنگی اور ہم آہنگی نہیں جو شعرائے فارسی کا طرۂ امتیاز ہے۔ البتہ جب شعرائے اردو نے غزل کا ساز چھیڑا تو اس میں صوفیانہ اصطلاحات حسن کاری کے تقاضوں کے ساتھ نظر آنے لگے۔

اُردو غزل اور تصوّف

اُردو غزل نے جب فارسی غزلوں کا رنگ و آہنگ اختیار کیا اور اس کی تشکیل اور تعمیر ہوئی تو اس میں تصوف کے آب و گل سے خمیر تیار ہوا اور یہ سہرا ولی دکنی کے سر بندھا۔ ولی کی شاعری میں حسن و عشق کی کشاکش بھی ہے اور تصوف کا خمیر بھی اور یہ بھی حقیقت ہے کہ جب اُردو غزل میں تصوف کے اصطلاحات کے ساتھ عشق مجازی و عشق حقیقی، وارداتِ قلبی، عرفان الٰہی اور تزکیۂ نفس اور تصفیۂ قلب کے خیالات و تجربات کی آمیزش ہوئی تو خیالات و کیفیات میں لطافت و سنجیدگی در آئی اور زبان و بیان میں بھی شیرینیت اور دلکشی پیدا ہوئی۔ اُردو غزل میں صوفیانہ خیالات وقت کی پکار اور اس کے تقاضے تھے۔ جیسا کہ ڈاکٹر ظہیر احمد صدیقی فرماتے ہیں:۔

"غزل کا مزاج دراصل عاشقانہ ہے۔ اس کے خمیر میں سب سے زیادہ جس چیز کا عنصر غالب ہے وہ حسن و عشق کے نغمے ہیں۔ یہی سبب ہے کہ غزل کی آفاقیت اور لچک نے دوسرے تصورات کو اپنا تو لیا مگر ان کو اپنا خاص موضوع نہیں بنایا۔ تصوف کی بنیاد ہی چونکہ جمالیاتی تصور پر قائم تھی اس لیے غزل اور تصوف ایک دوسرے سے جلد مانوس ہو گئے۔ تصوف کی راہ سے جو بھی موضوع غزل میں داخل ہوئے وہ اس کے لیے اجنبی نہ تھے۔ رفتہ رفتہ تصوف نے غزل کے مزاج میں اس حد تک دخل پا لیا کہ وہ غزل پھیکی معلوم ہونے لگی جس میں تصوف کی چاشنی نہ ہوتی۔

کیا مومن کی ان کے عہد میں عدم مقبولیت کا ایک سبب یہ نہیں ہے
کہ ان کا کلام تصوف کے عناصر سے خالی تھا۔ یہ ضرور ہے کہ تصوف
غزل کا ایک اہم جزو تھا۔ مگر یہ سنگلاخ وادی تھی کہ ہر شخص کی
ہمت اس وادی میں قدم رکھنے کی نہ ہوتی۔ کہنے کا مقصد
یہ ہے کہ صوفیانہ شاعری تو رسمی طور پر نبھ جاتی تھی مگر صحیح معنی
میں صوفی شاعر ہونا ہر کس و ناکس کے بس کی بات نہ تھی۔ اگر لوگ
صوفیانہ اشعار کہتے بھی تھے تو اس لیے کہ غزل کا رجحان غالب
وہی تھا اور یہ محرک اس قدر قوی تھا کہ ہمارے شعراء عقیدہ
کے لحاظ سے خواہ صوفی ہوں یا نہ ہوں مگر صوفیانہ اشعار کہنا
فرض خیال کرتے رہے۔ صوفی شعراء وہ افراد تھے جو دراصل
شاعری چیزے دیگر کے ساتھ بیان کی سنجیدگی، لب و لہجہ کی نرمی،
زندگی کے پوشیدہ رموز سے آگہی، فنائیت اور سپردگی، نامرادی
و برگشتگی، استغنا و بے نیازی کے اوصاف سے متصف تھے۔
یہ وہ چیزیں ہیں جن کے امتزاج سے صوفیانہ خمیر تیار ہوتا ہے اور
جب کسی شاعر کے یہاں یہ خصوصیات زمانہ کے نشیب و فراز یا
ذہنی صلاحیت کے باعث نمایاں ہوتی ہیں تو ہم اس کو صوفی کہتے
ہیں۔ یہی سبب ہے کہ اُردو شاعری میں صوفیانہ شاعری کی فراوانی
ہے مگر صوفی شاعر معدودے چند ہی ہوئے ہیں۔[۵۱]"

یہ ایک مسلمہ حقیقت ہے کہ اُردو شاعری تصوف کے بغیر بے جان ہے یعنی قالب
تو ہے لیکن روح نہیں۔ یہی وجہ ہے کہ اُردو شاعری کی ابتدا کے ساتھ ہی ساتھ تصوف
کے خیالات و افکار بھی داخل ہوتے رہے۔ قدیم شعرا کسی نہ کسی شکل میں مسائل تصوف پر

---

[۵۱] فانی کی شاعری ص ۶۶-۶۵ مصنفہ ڈاکٹر ظہیر احمد صدیقی

غور و فکر کرتے رہے اور اپنے تجربات و مشاہدات کو بھی شعری جامہ پہنایا۔ زندگی کی حقیقت، خدا کا وجود، بے ثباتیٔ عالم، فنا و بقا، عشق مجازی و عشق حقیقی، وحدت الوجود اور وحدت الشہود غرض کہ اسی قسم کے اور تصوف کے مسائل شعرا کے دل میں پرورش پاتے رہے۔ اس لیے ابتدا سے اب تک اُردو شعرا کسی نہ کسی شکل میں صوفیانہ افکار کو اپنے اشعار میں پیش کرتے رہے ہیں۔ جب ہم ان حقائق پر غور کرتے ہیں تو یہ حقیقت بھی سامنے آتی ہے کہ اُردو زبان و ادب کی تخلیق اور نشو و نما صوفیائے کرام ہی کی مرہون منّت ہیں۔ ان کا خلوص و محبت اور اخوت انسانی عوام کی توجہ کا مرکز اور کشش کا سامان بنی۔ عوام جوق در جوق ان کے حلقہ بگوش ہوئے، ساتھ ہی ساتھ علما اور شعرا بھی ان کی دعاؤں کے محتاج اور ان کی توجہ کے طالب، اس لیے کسب فیض کے لیے ان کی خدمت میں جاتے اور ان کے صوفیانہ خیالات سے متاثر ہوتے۔ اس کے علاوہ وہ صوفیا خود بھی صاحب سجادہ، علوم ظاہر و باطن سے آراستہ اور شاعر ہوتے۔ ان کی شاعری میں بھی اسی حقیقت کی ترجمانی ہوتی۔

دوسری وجہ اُردو شاعری میں تصوف کے اثر انداز ہونے کی یہ بھی ہے کہ اُردو شاعری فارسی شاعری سے براہ راست متاثر ہوئی۔ فارسی شاعری میں صوفیانہ خیالات کی ترجمانی، حقائق و معارف کی آگہی، واردات قلبی کی اثر پذیری، مشاہدات کی جلوہ سامانی کی اتنی شدت اور کثرت تھی کہ اُردو زبان و ادب اس سے دامن بچا نہ سکی۔ اور اردو شاعری میں بھی وہ خیالات فنی تقاضوں کے ساتھ داخل ہوئے۔ حضرت مولانا روم، حکیم سنائی، اوحدی کی عارفانہ مثنویوں میں جو رموز معرفت پیش کیے گئے ہیں ان سے اردو مثنوی متاثر ہوئی۔ اسی طرح سعدی، حافظ، عراقی، امیر خسرو، جامی کی فارسی غزلوں میں جو عشق حقیقی کی چوٹ، درد و کرب کی کسک، والہانہ کیف و کم منظا ہر خداوندی، واردات قلبی اور داخلی کوائف کی کیفیات نظر آتی ہیں ان ہی سے اُردو غزل بھی متاثر ہوئی۔ مختصر یہ کہ اُردو شاعری میں، تصوف کی جلوہ گری فارسی شاعری کی دین ہے۔

صوبۂ بہار میں اُردو شاعری اور صُوفیانہ غزل

ہندوستان کے دیگر صوبوں کی طرح بہار بھی ابتدا ہی سے علمی ماحول کا آئینہ دار رہا ہے۔ تلاش و جستجو سے یہ امر ظاہر ہو جاتا ہے کہ نہ صرف نثر میں بلکہ نظم میں جو ابتدائی نقوش پائے جاتے ہیں۔ ان میں بہار کا حصہ نمایاں نظر آتا ہے۔ بہار کے اسی ماحول میں مختلف ادوار میں ہمیں شعرا اور ادبا کی کثیر تعداد ملتی ہے۔ ان کی تخلیقات نے بہار کی ادبی فضا کو برقرار رکھا اور اردو کی ترویج و اشاعت بیشتر صوفیائے کرام کی وجہ سے ہوئی۔ صوبۂ بہار میں صوفیائے کرام کی آمد سنہ ۵۷۶ھ کے پہلے ہی سے شروع ہو گئی تھی لیکن امام محمد تاج فقیہہ اور ان کے شرکائے کار کی آمد سنہ مذکور میں ہوئی۔ آپ کے پرپوتے حضرت مخدوم جہاں شیخ شرف الدین احمدؒ (سنہ ۶۶۱ھ تا سنہ ۷۸۲ھ) اور آپ کے جانشین حضرت مولانا مظفر شمس بلخی المتوفی سنہ ۸۰۳ھ اور دوسرے بزرگانِ دین کے مقولے اور دوہے اردو کے نقوش اولیں ہیں۔ یہ بزرگانِ دین عہد قدیم میں صوفیائے دکن، گجرات، دلی اور پنجاب کے دوش بدوش نظر آتے ہیں۔ آپ کی خانقاہیں اور درسگاہیں رشد و ہدایت کے ساتھ ساتھ اُردو زبان کی ترویج و اشاعت کا مرکز بنی ہوئی تھیں مربوط طور پر اُردو شاعری یا نثر کے نمونے نویں یا دسویں صدی کے ہجری کے ابھی تک نہیں ملے ہیں لیکن تحقیق و تفتیش کا دروازہ کھلا ہوا ہے جس سے بہت کچھ اُمیدیں وابستہ ہیں۔ البتہ دسویں صدی ہجری کے اواخر یا گیارہویں صدی کے اوائل کی تخلیق کا نمونہ مجھے دستیاب ہوا ہے جس کے بارے میں انکشاف کر دینا ضروری سمجھتا ہوں کہ

یہ چند اوراق منظوم فقہ کے مجھے اپنے خاندانی کتب خانہ سے دستیاب ہوئے ہیں اس پر ۱۱۶۵ھ کی مہر ہے اور اس پر شرف الدین بڈھانوی کا نام ہے۔ لیکن حرف اور کاغذ قدیم ہے۔ اسی قسم کی دوسری تحریریں بھی دستیاب ہیں جس پر ۱۰۱۵ھ کی کتابت ہے۔ یہ نظم پندرہ صفحات پر مشتمل ہے۔ درمیانی اور آخری صفحات غائب ہیں۔ زبان کا ڈھانچہ کھڑی بولی کے ساتھ اور بولیوں سے بھی مخلوط ہے۔ نظم کی ہیئت مثنوی کی ہے۔ جا بجا فارسی اور عربی کے الفاظ ہیں۔ اس شاعر کا نام حسن بن یار ہے اس میں فقہی مسائل بیان کئے گئے ہیں۔ یہ کتاب خط نسخ میں ہے۔ کاغذ بھی بوسیدہ ہے۔ نمونہ کے طور پر چند اشعار پیش خدمت ہیں۔

ایکنت راجا سرجن ہار — جسکنہہ بوجھنہہ دوئی سنسار

تس کیں پہلیں کر توں یاد — تو تو ہووے دونہہ جگ شاد

اکھی شمس حسن بن یار

مومن کیرا جانک بچار

مذکورہ بالا حقائق سے یہ پتہ چلتا ہے کہ بہار کی ادبی روایتیں بہت قدیم ہیں اور جدید تحقیق سے یہ بھی پتہ چلتا ہے کہ دبستان دکن کے معاً بعد بہار میں تخلیق ادب کا کام شروع ہو چکا تھا اور یہاں کے صوفیائے کرام شعر و ادب کی آبیاری کر رہے تھے جس کی وجہ سے یہاں کی شاعری میں داخلیت کا عنصر غالب تھا۔ صوفیانہ خیالات، سنجیدگی اور پاکیزگی کی آمیزش نے یہاں کی شاعری کو اور چمکایا۔ پھر تاریخی وجوہ سے پٹنہ اور دہلی کی فضا ایک جیسی تھی۔ اس لیے دہلی کی مماثلت بھی اسے حاصل ہوئی۔

صوبہ بہار میں گیارہویں صدی ہجری سے اردو شاعری کا تسلسل ملتا ہے۔ مرزا عبدالقادر بیدل عظیم آبادی (۱۰۵۴ھ تا ۱۱۳۳ھ) کی تقلید شعرائے دہلی نے بھی کی ہے۔ سید عماد الدین پھلواروی (۱۰۶۵ھ تا ۱۱۲۴ھ) ملا محمد علیم تحقیق (۱۰۰۰ھ تا ۱۱۶۳ھ) غلام نقشبند سجاد، حضرت بی بی ولیہ، لالہ اُجاگر چند اُلفت، مہاراجہ رام نرائن موزوں، وغیرہ کے نمونہ کلام اردو میں ملتے ہیں۔ شاہ آیت اللہ جوہری (۱۱۲۶ھ تا ۱۲۱۰ھ) غلام یحییٰ حضور متوفی ۱۲۰۶ھ شیخ محمد روشن

جوشش عظیم آبادی (سنہ ۱۱۵۰ھ تا سنہ ۱۲۱۶ھ) ۔ شاہ نور الحق طپاں (سنہ ۱۱۵۶ھ تا سنہ ۱۲۲۳ھ) دل عظیم آبادی ۔ غلام علی راسخ عظیم آبادی (سنہ ۱۱۶۲ھ تا سنہ ۱۲۳۸ھ) ۔ شاہ ابوالحسن فرد (سنہ ۱۱۹۱ھ تا سنہ ۱۲۶۵ھ) کے علاوہ کچھ شعرائے شاہجہاں آباد بھی عظیم آباد آئے، اور یہاں کی ادب نوازی کی وجہ کر یہیں کے ہو رہے ۔ اشرف علی فغاں ۔ میر محمد باقر حزیں (سنہ ۱۱۶۵ھ) شاہ رکن الدین عشق (سنہ ۱۲۰۳ھ) ۔ مرزا محمد علی فدوی (سنہ ۱۲۱۰ھ) مہاراجہ کلیان سنگھ عاشق ۔ ضیا عظیم آبادی ۔ استاد میر حسن جیسی شخصیتیں عظمت و شہرت کی حامل رہیں ۔ مذکورہ بالا شعرا میں زیادہ تر صوفی شعرا تھے ۔ جن کے اشعار میں صوفیانہ خیالات کا میلان زیادہ پایا جاتا ہے ۔ غزل اور مرثیوں میں بھی انہوں نے طبع آزمائی کی ان میں راسخ عظیم آبادی کا نام زیادہ روشن ہے کیوں کہ وہ ایک خاص میلان کی وجہ سے شہرت و عظمت کے حامل ہوئے ۔ غزل اور مثنوی میں بیش بہا اضافے کیے ۔ ان کی غزلوں میں داخلیت کا عنصر غالب ہے ۔ اور ان کی مثنویاں بھی اسی میلان کی نمائندگی کرتی ہیں ۔

راسخ عظیم آبادی نے اُردو شاعری کی جو شمع جلائی تھی اس کی لو تیرہویں صدی ہجری میں اور تیز ہوگئی اور یہاں کی اُردو شاعری کے میلانات زیادہ قابل توجہ ہوگئے چنانچہ اس عہد میں شعرائے بہار نے شاعری کے مختلف اصناف پر طبع آزمائی کی اور اس میں کمال حاصل کیا ۔ راسخ عظیم آبادی کے شاگرد حسرت عظیم آبادی متوفی سنہ ۱۸۶۱ء، شاہ امیر الدین وجد (سنہ ۱۷۹۸ء تا سنہ ۱۸۶۳ء) جعفر حسین خاں فیض (سنہ ۱۲۱۵ھ تا سنہ ۱۲۸۳ھ) شاگرد مصحفی ، حسرت عظیم آبادی (سنہ ۱۲۳۱ھ تا سنہ ۱۳۰۴ھ) عبدالحمید پریشاں (سنہ ۱۲۴۵ھ تا سنہ) ۔ شوق نیموی (سنہ ۱۲۷۸ھ تا سنہ ۱۳۲۳ھ) ۔ شاد عظیم آبادی (سنہ ۱۸۴۶ء تا سنہ ۱۹۲۷ء) ۔ عبدالغفور شہباز (سنہ ۱۸۵۷ء تا سنہ ۱۹۰۸ء) ۔ صفیر بلگرامی (سنہ ۱۲۴۹ھ تا سنہ ۱۳۰۷ھ) ۔ اکبر داناپوری (سنہ ۱۲۶۰ھ تا سنہ ۱۳۲۷ھ) فضل الحق آزاد (سنہ ۱۸۵۲ء تا سنہ ۱۹۴۲ء) ۔ احقر بہاری (سنہ ۱۲۷۶ھ تا سنہ ۱۳۴۸ھ) ۔ امداد امام اثر (سنہ ۱۸۴۹ء تا سنہ ۱۹۳۰ء) ۔ مشرقی منیری (سنہ ۱۲۸۱ھ تا سنہ ۱۳۴۲ھ) وغیرہ اس عہد کے ممتاز شعرا ہیں ۔ ان شعرائے بہار نے نہ صرف غزل کی آراستگی میں کاوشیں کیں ۔

بلکہ مثنوی اور مرثیہ نگاری کو بھی بیش از بیش فروغ دیا۔

اُردو غزل کی روایت مربوط اور منظم شکل میں فارسی غزلوں کے ممائل صوفیائے کرام ہی کی مرہونِ منت ہے۔ جہاں تک تحقیق و جستجو کا تعلق ہے، یہ حقیقت سامنے آتی ہے کہ وَلی دکنی وہ پہلے شاعر ہیں جن کے کلام میں تغزل کی رنگارنگی بھی ہے اور تصوف کی ہم آہنگی بھی۔ وہ غزل گو شاعر کی حیثیت سے بھی پہلے شاعر ہیں اور غزل میں تصوف کی روایت کے اعتبار سے بھی امام نظر آتے ہیں۔ اور ان ہی کے معاصر شعراء میں صوبہ بہار کے ایک گراں قدر بزرگ صوفی شاعر حضرت شاہ کمال علی کمالؔ کا نام نامی آتا ہے۔ جن کی سنہ ولادت ۱۰۹۰ھ ہے۔ حقیقت تو یہ ہے کہ صوبۂ بہار میں اُردو کی ابتدائی نشو و نما بھی ان بوریہ نشیں بزرگوں کی خانقاہوں میں ظاہر ہوئی اور خونِ جگر سے اس کی آبیاری بھی کی۔ اسی طرح صوفیانہ غزل کی بھی ابتدا انہیں کی مرہونِ منت ہے۔ حضرت غلام نقشبند سجادؔ، رکن الدین عشقؔ، آیت اللہ جوہریؔ، مرزا محمد علی فدوی، نور الحق طپاںؔ، غلام یحییٰ حضورؔ اور متعدد خانوادے اور خانقاہوں کے سجادہ نشین کی غزلیں اس حقیقت کی ترجمان ہیں کہ صوبۂ بہار میں صوفیانہ خیالات کا اظہار اُردو غزلوں میں جس شد و مد کے ساتھ کیا گیا ہے وہ کسی دوسرے صوبہ میں نظر نہیں آتا ہے خواہ وہ شمالی ہند ہو یا جنوبی ہند۔ میں نے اپنی تصنیف "اُردو میں صوفیانہ شاعری" میں ان حقائق کا تذکرہ کیا ہے اور بڑی تحقیق و جستجو کے بعد ان کی مثالیں بھی پیش کی ہیں۔ تقریباً تمام شعرائے تصوف میں سے اڑتالیس ۴۸ فیصد صوبۂ بہار ہی کے صوفی شعرا ہیں۔ ان شعراء نے صوفیانہ خیالات کے ذریعہ اُردو غزل کو نہ صرف صوفیانہ رنگ و آہنگ سے آراستہ کیا ہے۔ بلکہ زبان کی شیرینی و لطافت بھی بخشا ہے اور مجھے کہنے دیجئے کہ صوفیانہ شاعری میں اور اس میدان میں وہ پیش پیش رہے ہیں۔ اس لیے صوفیانہ شاعری ہو یا غزل گوئی، ان کو نظر انداز کر دیا یا کوتاہ نظری سے کام لینا سراسر ناانصافی پر مبنی ہے جیسا کہ صوفیانہ شاعری پر متعدد تصانیف منظر عام پر آئیں اور اس صداقت سے خالی نظر آتی ہیں۔

اب میں اپنے اس دعوئ کی دلیل میں بہار کے ان غزل گو شعراء کا جائزہ لیتا ہوں، جن کے صوفیانہ خیالات نے غزل کو متانت اور سنجیدگی بخشی۔

حضرت شاہ کمال علی کمال دیورویؒ

صوبۂ بہار میں جاجیزی بزرگان دین مجاہد کی حیثیت سے بھی آئے اور صوفیٔ باصفا کی حیثیت سے بھی۔ یہ خاندان اپنی قدامت اور بزرگی کے اعتبار سے صوبۂ بہار میں مشہور و معروف ہے۔ حضرت شاہ کمال علی دیورویؒ اسی خاندان کے ایک فرد ہیں۔ آپ کا نسب نامہ پدری اس طرح ہے:-

"کمال علی ابن سید فیض علی قادری الگیاوی الجاجیری بن مولانا نصر اللہ عرف محمد نصیر خاں بن سید حسین بن میر سید محمد بن میر سید آدم" [1]

آپ کی نانیہال دیورہ ضلع گیا میں ہے۔ آپ کا نسب نامہ مادری حضرت مخدوم شاہ شعیب فردوسی منیریؒ کے مرید و مجاز حضرت اسحاق مغربیؒ ہیں اور ان کے مرید و خلیفہ حضرت مخدوم شاہ برہان الدین فردوسی دیورویؒ تک پہنچتا ہے۔ حضرت شاہ کمال علیؒ اپنے عہد کے مشہور بزرگ حضرت شاہ غلام علی فردوسی دیورویؒ کے نواسے تھے۔ آپ کی پیدائش اپنی نانیہال دیورہ میں سنہ ۱۰۹۰ھ میں ہوئی۔ (ایک قدیم فرمان خانقاہ کمالیہ میں ہے جس پر قاضی غلام حیدر کی مہر ثبت ہے اور وہ سنہ ۱۱۰۹ فصلی مطابق سنہ ۱۱۱۱ھ کی تحریر ہے اس میں شاہ کمال علیؒ کو جاگیر دی گئی ہے۔ اس اعتبار سے آپ کی ولادت خاندانی روایت کے اعتبار سے سنہ ۱۰۹۰ھ درست ہے)۔ آپ کی ابتدائی تعلیم آپ کے نانا حضرت شاہ غلام علی دیورویؒ کے زیر سایہ ہوئی اور پھر اپنے والد شاہ فیض علی

---

[1] نسب نامہ فیض الرحمٰن قلمی مصنفہ حضرت سید فیض علی، خانقاہ برہانیہ کمالیہ دیورہ

سے بھی پڑھا۔ اس کے بعد جب طلب علم کا شغف بڑھا تو آپ عظیم آباد تشریف لے گئے اور شاہ عزیز اللہ پلاموی کے مدرسہ میں ملا میرزا ہد علی میرٹھی کے زیر تعلیم رہے اور حدیث و فقہ میں کمال پیدا کیا۔ مزید علم کا شغف بڑھا تو آپ لکھنؤ تشریف لے گئے۔ اس وقت علمائے فرنگی محل اپنے علم و فضل کی وجہ سے مرکزی حیثیت رکھتے تھے۔ چنانچہ آپ وہاں حضرت ملا نظام الدین فرنگی محلیؒ کے زیر تعلیم رہے۔ بعض روایت کے اعتبار سے یہ مشہور ہے کہ آپ مولانا بحر العلوم فرنگی محلی سے پڑھتے تھے۔ تعلیم ظاہری کے بعد تعلیم باطنی کی جانب متوجہ ہوئے۔ آپ نے باطنی تعلیم اپنے نانا حضرت شاہ غلام علیؒ سے پائی اور آپ ہی کے دست حق پرست پر بیعت بھی ہوئے لیکن آپ کو اجازت و خلافت اپنے ماموں حضرت غلام علی دیورویؒ سے ملی۔ مرشد نے آپ کے علم باطنی کی تکمیل کی اور درجہ کمال تک پہنچا دیا۔ پیر و مرشد کے وصال کے بعد آپکے معاصر بزرگوں نے آپ کو خانقاہ برہانیہ کے سجادہ نشیں کے لیے منتخب فرمایا لیکن آپ اپنے پیر و مرشد کے نواسے شاہ خادم علی کو اپنے بدلے میں مسند سجادگی پر بٹھایا۔ آپ نے طویل عمر پائی اس لیے کہ آپ کا وصال ۱۲۱۵ھ میں ہوا اور دیورہ ہی میں مدفون ہوئے۔

آپ فطری شاعر تھے اور شعر و سخن کا ذوق بچپن ہی سے تھا لیکن جذبۂ شوق اس وقت زیادہ ہوا جب آپ دوران تعلیم لکھنؤ میں قیام پذیر تھے چونکہ اس وقت لکھنؤ میں شعر و سخن کا زور زیادہ تھا، مشاعروں کی جلوہ آرائیاں اپنے شباب پر تھیں لیکن اس کا پتہ نہ چل سکا کہ آپ مشاعرے میں شرکت فرماتے تھے یا نہیں۔ آپ نے غزلیں کہی ہیں۔ جو بڑی تقطیع کے ۵۲ صفحات پر مشتمل ہیں جس میں سات سو ایک اشعار ہیں، بارہ مثنویاں بھی اردو میں ہیں جن کے اشعار کی تعداد پانچ سو چھیاسٹھ ہے۔ آپ کا دیوان مخطوطہ کی شکل میں اب تک محفوظ ہے جو خانقاہ برہانیہ کمالیہ کی زینت ہے۔ ۱۹۷۸ء میں راقم الحروف پروفیسر عطا کریم برق صدر شعبۂ فارسی و عربی کلکتہ یونیورسٹی کے ساتھ خانقاہ مذکور میں حاضر ہوا اور شاہ انور علی سلمہ کی وساطت سے اس گراں قدر دیوان کا بالاستیعاب مطالعہ کیا۔ حضرت شاہ علی ولی دکنی اور فائز

دہلوی کے معاصر تھے اور ان کی شاعرانہ شہرت اپنے عہد میں ہو چکی تھی۔ اسی لیے آپ کے معاصر تذکرہ نگار غلام حسین شورش نے اس طرح لکھا ہے :

"کمال علی ولد سید فیض علی بن سید محمد نصیر خاں، کمال تخلص، ساکنان قصبہ گیا مان پور نبیرہ حضرت شاہ غلام علی قدس سرہٗ العزیز متوطن موضع دیورہ، پرگنہ اروِل، فاضل جید شاگرد حضرت مولوی محمد وحید قدس سرہٗ شاعر فارسی۔ گاہ گاہ فکر ریختہ ہم می نماید از دست۔"

لیلیٰ چھپی ہے عکس ہو پردے میں آب کے
پھرتے انا گستہ ہیں محمل حباب کے

پیری میں دم سرد نہ ہوں کیونکے غنیمت
کھل جاوے ہے غنچہ کی گرہ باد سحر سے[1]

حضرت شاہ کمال علیؒ صوفی باصفا تھے اور شاعر باکمال بھی۔ آپ کے اشعار میں تصوف کا گہرا امتزاج ہے۔ تصوف کے مختلف نکات کو نہایت خوش اسلوبی سے دل کش پیرائے میں بیان کیا ہے۔ اس کا اندازہ تو آپ کے کلام ہی سے کیا جا سکتا ہے۔ ایک غزل کے تین اشعار ملاحظہ ہوں ؎

گر عزم کرے اس کی تجلی کے بیاں کا
روشن ہے جلے شمع صفت تازہ زباں کا

کب تیر خطا ہووے اس ابرو کے کماں کا
اس سینۂ زخمی سے سمجھ حال نشاں کا

کب قافلہ وادی کوہ محبت کی کرے طے
یاں بدرقہ حیرت سے ہوا سنگ نشاں کا

دوسری غزل کے چند اشعار پیش کیے جاتے ہیں جس میں تصوف کی چاشنی بھی ہے اور تغزل کی رنگارنگی بھی۔ ملاحظہ ہوں ؎

---

[1] تذکرۂ شورشؔ، مرتبہ : ڈاکٹر محمود الٰہی

عجب کہ یاد ہیں وہ زلف مشک سا نہ رہے
وہ کون سر ہے کہ جس سر میں یہ ہوا نہ رہے

خیالِ یار کا رہتا ہے چشمِ گریاں سوں
جہاں کہ چشمہ نہ جاری ہو کارواں نہ رہے

جو وصل ہو بھی میسّر تو کیا کہوں احوال
دو چار یار کے مُنہ ہوں میری زباں نہ رہے

عجب کہ موسم پیری میں خوابِ غفلت ہو
کہ صبح ہوئے سرا بیچ کارواں نہ رہے

جسے شعور ہے کچھ بھی وہ اس قدر جانے
قضا بھی کچھ ہے اگر بندہُ رضا نہ رہے

یہ بادیۂ محبّت میں بے دلیل نہ جا
کہ کارواں کو خطر ہے جو رہنما نہ رہے

خطر ہے بحرِ خرد میں اگر جنوں نہ ہوئے
جہاز غرق ہوا اس میں گر اس میں ناخدا نہ رہے

حضرت غلام نقشبند سجّادؒ

حضرت عماد الدین قلندرؒ صوبہ بہار کے وہ عظیم المرتبت بزرگ ہیں جن کی شہرت بزرگی کے اعتبار سے بھی ہے اور اُردو ادب کے شاعر و نثار کی حیثیت سے بھی۔ اُردو نثر نگاری اور شاعری میں ان کو تفوق اور تقدم حاصل ہے۔ حضرت غلام نقشبند سجّاد ان ہی کے صاحبزادے اور جانشیں ہیں۔ یہ حقیقت ہے کہ آپ نے ادب نوازی ورثے میں پائی تھی۔

آپ کا اسم شریف غلام نقشبند اور نسبت قلندر رہے اور آپ کا تخلص سجاد ہے۔ آپ کی ولادت باسعادت ۱۱۱۶ھ میں عہد عالم گیری میں پھلواری میں ہوئی۔ آپ کے چچا حضرت شاہ ابو تراب قلندرؒ نے آپ کی سنہ پیدائش کی تاریخ "شمع خاندان" سے نکالا ہے۔ ابھی آپ آٹھ ہی برس کے ہوئے تھے کہ اپنے والد کے سایہ رحمت سے محروم ہو گئے۔ مشائخ عظام کی نظر شفقت اس دُرِّ یتیم پر پڑی اور آپ کے والد حضرت خواجہ عماد الدین قلندرؒ کے فاتحہ چہارم کے روز حضرت تاج العارفین پیر مجیب اللہ قدس سرہٗ نے جو آپ کے والد کے ماموں زاد بھائی اور مرید وخلیفہ تھے، آپ کی بیعت لے کر ۲۳ جمادی الاول ۱۱۲۴ھ کو آپ کے والد کی مسند سجادگی پر بٹھایا اور تعلیم ظاہری وباطنی میں آپ کو مشغول کیا۔ تعلیم ظاہری وباطنی کی تکمیل کے بعد ۱۱۴۵ھ میں اجازت وخلافت سے بھی نوازا اور اسی پر بس نہیں کیا بلکہ حضرت پیر مجیب اللہؒ نے آپ کو منتخب کر کے اپنے دامادی کا بھی شرف بخشا۔ ۱۱۷۳ھ تک آپ ایک جہاں کو فیضیاب کرتے رہے اور خدمت خلق پر مامور رہے۔ بالآخر ۱۱۷۳ھ میں آپ اپنے معبود حقیقی سے جا ملے اور اپنے والد حضرت عماد الدین قلندرؒ کے پائیں میں مدفون ہوئے پھلواری شریف میں آپ کا مزار مبارک مرجع خاص وعام ہے۔ آپ کے وصال کے بعد آپ کے سجادہ نشیں آپ کے داماد حضرت نور الحق طپاں ہوئے۔

حضرت سجاد نے فارسی اور اردو دونوں زبانوں میں طبع آزمائی کی ہے، لیکن صوبہ بہار میں اردو شاعر کی حیثیت سے اور خصوصیت کے ساتھ صوفی شاعر کی حیثیت سے ممتاز اور منفرد ہیں۔ حضرت رکن الدین عشق سے پہلے خانقاہ عمادیہ کے صاحب سجادہ ہو کر ایک طرف رشد وہدایت کی تعلیم دے رہے تھے تو دوسری طرف اردو شاعری میں صوفیانہ رنگ کی آمیزش کر کے عشق حقیقی کی آگ سے اہلِ دل کو گرما کر کیف آگیں بنا رہے تھے۔ حضرت سجاد کے کلام میں جو سوز وگداز، عشقِ حقیقی کی گرمی اور سوز دروں کی کیفیتیں پائی جاتی ہیں وہ انہیں صوفی شاعر کی حیثیت سے انفرادیت بخشتی ہیں۔ ایک غزل کے چند اشعار ملاحظہ کیجئے جس میں تصوف کے نکات کو اور صوفیانہ

خیالات کو بڑے دلکش انداز میں پیش کیا ہے۔ ملاحظہ ہو ؎

جب موسم گل آن کے تائید کرے ہے ... تب جوشِ جنوں عقل کی تردید کرے ہے

اُٹھے گا یہاں پھر نہ کبھی شورِ تمنّا ... دل پیچ یہی یاس اب اُمید کرے ہے

جو بیچ محبت کے فنا ہووے ہے اے دل ... حاصل وہی تو ہستیٔ جاوید کرے ہے

جس روز کہ پہنچے ہے نئی کوئی مصیبت ... اس روز ترا خوگرِ غم عید کرے ہے

رکھے ہے جبیں در پہ ترے گنبدِ گرداں ... سجدہ ترے دروازے پہ خورشید کرے ہے

سجّاد جو سمجھا ہے خود اپنے تئیں موجود

وہ فہم نہیں معنی توحید کرے ہے

حضرت سجّاد کی ایک مشہور غزل ہے جس میں قدامت بھی ہے اور عاشقانہ رنگ بھی اور صوفیانہ آہنگ بھی۔ ملاحظہ کیجئے ؎

کھٹی کو چلا کیا ہوتے سحر پوچھو تو کوئی سجّاد ستی

تمھارا ت تلک تو کام اس کو اشغال ستی اوراد ستی

ٹک میری طرف سے بادِ صبا جا کر کہہ صیاد ستی

اب جان لبوں پر بلبل کے پہنچی ہے تری بیداد ستی

تنہائی فرقت میں کیا کیا اپنا نہ یہ دل گھبراوے ہے

پہلے ہے جو ٹک یہ ناشری تو صرف تمہاری یاد ستی

جب آگ دھدکتی ہو اس پر مت چھیٹو تیل خدا را تم

کیا دل کی خوشی کو پوچھو ہو اے یارو اک ناشاد ستی

لے بادِ سحر اے موجِ صبا لے جلد ہماری آ کے خبر

نکلا ہے ہمارا کام سدا تیری ہی فقط امداد ستی

من پایا ہے اس نے دل میرا کعبہ ہے گھر اللہ کا ہے

اب کھود کے اس کو پھینکوا دے وہ بُت نہ کہیں بنیاد ستی

جو دیکھ کے ہم کو ہاتھ ملے، پچھتاوے اور افسوس کرے
بتلا دو کوئی کریں شکوہ کیا ایسے ستم ایجاد سے ہی
کھانا تو بہت اب جاویں گے ہر گز نہ کسو کے کوچے میں
ہر بار مگر مجبور رہے ہم اپنے دل ناشاد سے ہی
توڑا ہے وہ کب کا تقویٰ کو بھٹی ہیں تو اس کے گزرے ہے -
سجادہ و مسجد کی بابت مت پوچھو کچھ سجاد سے ہی

سجاد کی دوسری غزل بھی صوفیانہ خیالات سے لبریز ہے اور شاعر موصوف نے نت نئے انداز سے پیش کیا ہے ۔

سمجھاؤں ہوں یہی دل ناکام کے تئیں
آغاز بیچ سوچ لے انجام کے تئیں
کیا جاوے گا بگڑ کہیں قدرت کا ہاتھ تک
دیوے پلٹ جو گردش ایام کے تئیں
سودا کرے ہے غم کا جو بازار عشق بیچ
سو دکھ کے بھاؤ بیچ ہے آرام کے تئیں
واعظ سنا دے سدرہ طوبیٰ کی گفتگو
ہم چاہیں اپنے سرو گل اندام کے تئیں
بولے ہے شیخ مجھ سنتی ساقی کو کہدو تم
ایدھر کو بھی بڑھا دے کسو جام کے تئیں
زاہد کرے ہے کعبہ میخانہ کا جو حج
رنگے ہے مے میں جامۂ احرام کے تئیں
بھاوے نہیں ہے شیخ کی صحبت یہ مکھو
بیٹھا دو ساتھ مت کسو بدنام کے تئیں
سجاد کا ہے کھینچے ہے تو آہ نارسا
توڑے ہے کوئی بھی ثمر خام کے تئیں

حضرت شاہ رکن الدین عشق رح

ہندوستان میں سلسلہ ابو العلائیہ کا فیضان اور اس کی مقبولیت اس طرح ہوئی کہ ہر خانقاہ سے اس کا فیضان جاری و ساری ہوا۔ سلسلہ ابو العلائیہ کے

بانی مبانی حضرت سیدنا امیر ابوالعلا ہیں۔ یہ سلسلہ دراصل سلسلۂ نقشبندیہ کے اصول تعلیم کا مختصر نصاب ہے۔ اس لیے اس سلسلے میں عشق و توحید کی تعلیم لازمی ہے۔ حضرت سیدنا ابوالعلاؒ کے مرید و خلیفہ میر سید دوست محمدؒ تھے اور یہی وہ بزرگ ہستی ہیں جن کے دستِ حق پرست پر حضرت شاہ رکن الدین عشقؒ کے نانا حضرت شاہ محمد فرہاد دہلویؒ مرید ہوئے۔ اور ان ہی سے اجازت و خلافت بھی پائی۔ حضرت شاہ محمد فرہاد دہلویؒ کے والد دماجد دکن کے صوبے دار ہوکر اورنگ آباد میں تھے اور اسی وجہ سے شاہ فرہادؒ اورنگ آباد جاتے اور حضرت میر سید دوست محمدؒ کی خدمت میں حاضر ہوتے اسی طرح پر عقیدت بڑھی اور ان سے مرید ہو گئے۔ اپنے پیر کے حکم کے مطابق دہلی آکر اپنا چشمۂ فیض جاری کیا۔ آپ کا وصال ۱۱۲۵ھ میں ہوا۔ آپ کے خلفا میں حضرت برہان الدین خدانماؒ اور میر اسد اللہؒ دو بزرگ ہوئے۔ [۱]

حضرت شاہ رکن الدین عشقؒ، حضرت شیخ محمد کریم فاروقیؒ کے صاحبزادے تھے اور اپنے عہد کے مشہور بزرگ حضرت شاہ محمد فرہاد ابوالعلائی دہلویؒ کے نواسے تھے۔ آپ کا سلسلۂ نسب پدری خلیفۃ المسلمین سیدنا عمر فاروقؓ سے ملتا ہے۔ اسی اعتبار سے آپ کے والد کی نسبت فاروقی تھی۔

آپ کی ولادت باسعادت دلی میں ۱۱۲۷ھ میں ہوئی۔ ابتدائی تعلیم دستور کے مطابق دینی اور روحانی ہوئی۔ درانی حملے کے بعد دلی میں لوٹ مار مچی اور دلی تباہ و برباد ہو گئی۔ یہاں کے شرفا ہجرت پر مجبور ہو گئے۔ چنانچہ حضرت رکن الدین عشق رحمۃ اللہ علیہ بھی درانی حملے کے بعد مرشدآباد آ گئے اور نواب میر قاسم کی رفاقت میں ہزار سوار کی افسری کے منصب پر فائز ہوئے۔

ایک عرصہ تک فوجی ملازمت کرنے کے بعد حضرت عشق عظیم آباد تشریف لائے۔ عشقِ حقیقی کی آگ لگی، طلب پیر کا جذبہ پیدا ہوا۔ اس وقت عظیم آباد میں حضرت

---

[۱] یادگارِ عشق مصنفہ ثاقب عظیم آبادی ص ۱۵-۱۴ مطبوعہ ۱۳۴۸ھ

منعم پاک بازؒ کی عظمت و شہرت کا بہت چرچا تھا۔ اس عہد کے تمام صوفیائے کرام آپ کے فیضانِ صحبت سے فیضیاب ہو رہے تھے۔ حضرت عشقؒ بھی آپ کی خدمت میں گئے اور آپ سے علوم روحانی کے طالب ہوئے۔ حضرت نے ان کو اپنی صحبت میں رکھ کر فیوض روحانی سے مالا مال کیا۔ مرید ہونے کی تمنا تھی اور دل میں بچپن ہی سے اپنے نانا کے مرید و خلیفہ حضرت برہان الدین خدا نماؒ سے بھی عقیدت تھی اور ان ہی سے مرید ہونے کی بھی ایک کسک دل میں تھی کہ خود حضرت منعم پاک بازؒ نے بشارت دی کہ "تمہاری عقدہ کشائی حضرت برہان الدین خدا نما قدس سرہٗ سے ہے۔" آپ حضرت برہان الدین خدا نما قدس سرہٗ کی خدمت میں گئے اور ان کے دست حق پرست پر بیعت ہوئے۔ آپ نے اپنی صحبت میں رکھ کر تعلیم و تلقین کی' ذکر و اشغال میں بھی مشغول کیا اور پھر آپ کو اجازت و خلافت سے نوازا اور ہدایت کی کہ منعم پاکؒ کی صحبت سے مستفیض ہوں۔ چنانچہ آپ پھر عظیم آباد تشریف لے آئے اور حضرت سے درس ارشاد لینے لگے اور آپ کے ایسے شیدائی اور فریفتہ ہو گئے کہ عظیم آباد ہی میں مستقل سکونت اختیار کر لی۔ رشد و ہدایت کے لیے ایک خانقاہ کی بنیاد ڈالی جو پہلے شاہ گھسیٹا تکیہ کہلاتا تھا۔ اب تکیۂ عشق کے نام سے مشہور ہے۔ آپ کی خانقاہ سے سلسلہ رشد و ہدایت کو بہت فروغ ہوا خصوصاً سلسلہ ابو العلائیہ کا فیضان جاری و ساری ہوا' اور بارہویں صدی ہجری میں سلسلہ ابو العلائیہ کی اتنی مقبولیت اور توسیع ہوئی کہ بہار کی تمام مشہور اور قدیم خانقاہوں میں اس کا فیضان کسی نہ کسی طرح ضرور پہنچا۔ آپ کا وصال تکیۂ شاہ عشق میں ہوا اور اسی خانقاہ کی محبوب خاک میں آپ کی آخری آرام گاہ بنی۔ آپ کا مزار مبارک مرجع خلائق ہے۔ آپ کے شاگرد فدوی نے تاریخ رحلت لکھی ہے۔

ھ
گفت فدوی سال تاریخ وفات
ہادیٔ ما شاہ رکن الدین عشقؒ

۱۲۰۳

غلام حسین شورش بھی حضرت کے بڑے معتقد اور تربیت یافتہ تھے۔ حضرت عشق ہی کے ایما پر اپنا مشہور تذکرہ "تذکرۂ شورش" لکھا ہے۔ جس میں حضرت کے حالات اور انتخاب کلام اس طرح لکھتے ہیں:

"حضرت شاہ رکن الدین عشق عرف مرزا گھسیٹا مدظلہ العالی صاحب دیوانِ ریختہ، ساکن شاہجہاں آباد، نبیرہ حضرت شاہ فرہاد نقشبند قدس سرہٗ از بست دو سال در عظیم آباد تشریف آوردہ و ترک روزگار نمودہ، استقامت فرمودہ و توکل را رفیق خود ساختہ، خلائق را در علم ظاہر و باطن تربیت می فرمائید خصوصاً قطب ہائے علم تصوف مثل مثنوی حضرت مولوی و شرح رباعیات حضرت مولوی جامی و لمعات وغیرہ اکثر مردم می خوانند و تخلص بزرگان می مانند و سماع را دوست می دارند آنچہ انسان کامل را می باید ہمہ می دانند۔ حق تعالےٰ سلامت دارد۔

چشم خلق کے گو مثل حباب آتا ہوں
عین دریا ہوں حقیقت میں بہا جاتا ہوں" [۱]

حضرت عشق اردو کے بلند پایہ شاعر ہیں۔ خصوصیت کے ساتھ صوفیانہ شاعری میں تو آپ کا منفرد رنگ ہے اور بلند مقام۔ اور یہ حقیقت ہے کہ حضرت عشق کا اصلی رنگ ان کے عارفانہ کلام میں ہے۔ عارف باللہ عشق حقیقی میں تپ کر فنائیت حاصل کرتے ہیں۔ حضرت عشق کے نزدیک عشق حقیقی کائنات کی سب سے بڑی قوت ہے اور اس کا دائرہ بہت وسیع اور لامتناہی ہے۔ اس کی رسائی عرش تک ہے۔ حضرت کے اشعار میں اس کو دیکھئے

کیا زباں پر آسکے ہے رازِ عشق گو کہ دل میں آئی ہے آوازِ عشق

---

[۱] تذکرۂ شورش ص ۴۳۸

عرش پہ بجتا ہے یاروسا زعشق   وہم جن وانس سے ہے وہ پرے

اللہ تعالیٰ کی جلوہ گری کہاں نہیں ہے۔ ہر جگہ مظاہر خداوندی کی ہی جلوہ آرائیاں ہیں ؎

عرش تا فرش کر نظر دیکھا   تو ہی آیا نظر جدھر دیکھا

حرم میں نام سُنا دَیر میں نشاں دیکھا   سوائے تیرے نہ دیکھا غرض جہاں دیکھا

اور ان اشعار میں تصوف کا رنگ اور حضرت عشق کا آہنگ ملاحظہ کیجئے ؎

دیدہ و دل جو کرکے وا دیکھا   حرم و دَیر میں خُدا دیکھا

اس کے دامن تلک نہ پہنچے ہم   خاک میں آپ کو مِلا دیکھا

آشنا تجھ سے ہو نہ ہو کوئی   پر تجھے سب سے آشنا دیکھا

قلب انسانی جلوۂ مظہر خداوندی ہے اور اسے اسی لیے عظمت حاصل ہے حضرت نے اس خیال کو اس طرح پیش کیا ہے۔ ؎

دیر و کعبہ میں کیا کروں جاکر   دل میں تیرا مکان دیکھ لیا

آئینہ کو جلا جو دیتا ہے   اے صبا وہ غبار ہے میرا

ذات باری میں فنا ہوکر بقا کا درجہ حاصل ہوتا ہے ؎

خودی کو بے خودی کہتے ہیں آؤ مجھ فنا فی ہو

نہ کھودے گا جو کوئی آپ کو واصل نہ ہووے گا

ہمہ اوست یعنی وحدت الوجود کے مسلک کو اس طرح پیش کیا ہے ؎

فرق اتنا ہوا تفتیش نظر سے معلوم

بُلبلہ آپ کو اور تجھ کو میں دریا دیکھا

تعلیم قناعت اور توکّل کو اچھوتے اور دلکش انداز میں پیش کیا ہے ؎

وہ شکوہ شکایت کرے جو آپ بھی کچھ ہو
عارف کی نظر میں نہ چناں ہے نہ چنیں ہے

حضرت کی ایک غزل جو عارفانہ رنگ میں ہے وہ پیشِ خدمت ہے جس سے ان کے صوفیانہ مزاج کا اندازہ ہوتا ہے ؎

احدیت کا جب ورود ہوا	نورِ وحدت کا تب شہود ہوا
واحدیت ہوئی نمود اس پر	خالق و خلق کا وجود ہوا
عالم ارواح کا ہوا پیدا	شکر ہستی ہوا سجود ہوا
بعد اس کے مثال کا عالم	اس پر اجسام پھر فزود ہوا
اتنے پردے جو ذات نے پہنے	کوئی مومن کوئی یہود ہوا
نورِ احمد نے جب تجلی کی	سربسر خلق کو یہ سود ہوا

عشق عاشق ہوا اسی کو دیکھ
دلِ نالاں برنگِ عود ہوا

اس کے چہرے پہ خدا جانے یہ کیسا نور تھا
ورنہ یہ دیوانگی کب عشق کا دستور تھا
سرمۂ وحدت جو کھینچا عشق نے آنکھوں کے بیچ
جون سا پتھر نظر آیا وہ کوہِ طور تھا
پاس آنے کو مرے بُعدِ مسافت کچھ نہ تھی
غور کر دیکھا تو میں ہی دل سے تیرے دور تھا
لگ گیا ناگاہ اس پر یہ نیرا تیرِ نگاہ
دل کا شیشہ جو بغل میں ہم نے دیکھا چور تھا
دل کو تیرے دکھ دیا ہے عشق کن نے ہم سے کہہ
شوخ تھا بے باک تھا، خونخوار تھا مغرور تھا ؎

ماہنامہ نصرت سنہ ۱۷۱ صفحہ ۔ شکیل اکبرآبادی ۲۔

آنکھوں کو تری دیکھیں گے میخانہ کہیں گے ہونٹوں کو جو پوچھو گے تو پیمانہ کہیں گے
وابستہ تری ذات سے بستی ہے جہاں کی جب تو نہ ہوا خلق میں ویرانہ کہیں گے

یہ بات جو ہے آج دمِ نقد عزیزاں
اس عشق کو سنتے ہو کل افسانہ کہیں گے [1]

حضرت آیت اللہ جوہریؒ

آپ کا اسم شریف آیت اللہ اور تخلص جوہری ہے۔ آپ کی پیدائش ۷ شوال ۱۲۲۶ھ ہے۔ آپ حضرت مولانا شاہ محمد مخدوم کے فرزند و جانشین ہیں۔ اور حضرت شاہ محمد مجیب اللہ پھلواروی کے داماد بھی ہیں۔ اپنے والد ماجد سے معمول کے مطابق کتب درسی پڑھی پھر اپنے چچا ملا محمد وحید الحق سے حدیث وفقہ پڑھی۔ تحصیل علوم ظاہری کے بعد علوم باطنی کی تکمیل میں مشغول ہو گئے۔ اپنے والد حضرت شاہ مخدومؒ سے سلسلہ قادریہ میں مرید ہوئے۔ ۱۲۷۳ھ میں اپنے والد کے وصال کے بعد مسند سجادگی پر بیٹھے۔

آپ کو فنِ شاعری سے کافی شغف تھا۔ فارسی میں شعر کہتے تھے اور اس میں شورش تخلص تھا۔ لیکن جب اُردو میں شاعری کرنے لگے تو اس کا تخلص جوہری رکھا۔ اُردو کے شاعر کی حیثیت سے آپ مشہور ہو چکے تھے۔ اس لیے کہ "تذکرہ شورش" میں آپ کا نمونۂ کلام کافی درج ہے۔ "تذکرہ شورش" میں ہے:

"شاہ آیت اللہ سلمہ اللہ، جوہری تخلص۔ فرزند شاہ مخدوم قدس سرہٗ و خویش حضرت شاہ مجیب اللہ مدظلہ العالی۔ ساکن قصبہ پھلواری

---

[1] یادگارِ عشق ص ۱۴۵ مصنفہ ثاقب عظیم آبادی

بزرگی ہر دو بزرگان مشہور و معروف است۔ کہ یکہ با فقیر راہ و ربط می دارد۔ می دادند و مریدیز از والد خود اند۔ چنانچہ فرمودہ۔

اور سے ہیں ملتجی ہونے کا نہیں اے جوہری
وارثِ حال نبی مخدوم ہے مرشد مرا

ولطف دیگر دریں شعر این ست کہ از حضرت شاہ محمد وارث محمد آباد بنارسی قدس سرہٗ نیز خاندانِ ایشاں رافیض است۔ بہر حال گاہے شعر فارسی، گاہے شعر ریختہ می فرمایند۔ با فقیر از مدت مربوط اند و توجہ کریمانہ الحال می فرمایند۔ حق تعالےٰ خوش و خرم بر مسند ہدایت وارث دنگاہ دارد۔" [1]

جوہری صوفیانہ مزاج رکھتے تھے۔ اس لیے تصوف کی ہماہمی اور عشق حقیقی کی گرمی ان کے کلام میں ہے۔ اس قبیل کے چند اشعار ملاحظہ فرمائیں ؎

تا قیامت بند ہونے کا نہیں ہے بابِ فیض
عقدۂ دل ناخنِ دستِ پیمبر سے کھلا

عشق پر زور نے کیا کیا نہ کیا خانہ خراب
کوہ کن کوہ ہوا قیس ہوا صحرائی

دل میں آتا ہے کہ دل سب سے جدا کر لیجئے
شوخ اس بُت کے تئیں اپنا خدا کر لیجئے

---

[1] تذکرۂ شورش ص ۱۳۷ مرتبہ ڈاکٹر محمود الٰہی

مرزا محمد علی فدوی

یہ حقیقت ہے کہ دُرانی حملے کے بعد دِلّی کی جو تباہی اور بربادی ہوئی اس کے پیش نظر شعرائے دلّی نے اپنی عزت و آبرو کی بقا کے لیے اور پھر اقتصادی زبوں حالی کو دُور کرنے کے لیے اپنی نظریں دوسری جگہوں پر ڈالیں۔ ان میں ایک طرف لکھنؤ تھا تو دوسری طرف عظیم آباد۔ غرض کہ دبستانِ دلّی کے شعرا نے ہجرت کی۔ مرزا محمد علی فدوی بھی ان میں سے ایک ہیں۔

مرزا محمد علی نام، عرف بھجوا اور تخلص فدوی تھا۔ احمد شاہ بادشاہ کے یہاں وقائع نویسی کے عہدے پر مامور تھے۔ آپ کی پیدائش کے بارے میں ڈاکٹر سید محمد حسنین کا خیال ہے کہ ۱۱۴۲ھ تا ۱۱۵۲ھ میں آپ کی پیدائش ہوئی۔ ثاقب عظیم آبادی نے لکھا ہے کہ حضرت عشق کے ساتھ ۱۱۶۲ھ میں عظیم آباد تشریف لائے اور پھر یہیں کے ہو رہے۔ یہ حقیقت ہے کہ فدوی صوفیانہ مزاج رکھتے تھے اس لیے آپ حضرت عشق کے حلقۂ ارادت میں آئے اور زانوئے تلمذ بھی ان ہی کے سامنے تہ کیا۔ اپنے پیر و مرشد حضرت عشق کے اتنے شیدائی تھے کہ ان کے دامن سے اس طرح وابستہ ہوئے کہ مر کر بھی ان سے الگ نہ ہوئے اور ان ہی کے حلقۂ مزار میں مدفون ہوئے۔

فدوی اُردو شاعری میں ایک بلند مقام کے مالک ہیں ان کی شاعری میں داخلیت بھی ہے اور خارجیت بھی۔ حضرت عشق کے فیض صحبت سے انہوں نے عشق حقیقی کی تڑپ پائی۔ مجاز میں حقیقت کو ڈھونڈا۔ سوز و گداز کی لپٹ نے ان کی شاعری کو دو آتشہ بنا دیا اگرچہ آپ کے کلام میں صوفیانہ رنگ کا گہرا امتزاج نہیں ہے پھر بھی حضرت عشق کے فیض تربیت نے آپ کو بہت کچھ دیا۔ ڈاکٹر سید محمد حسنین اپنے تحقیقی مقالہ میں لکھتے ہیں:

عشق میں تارک الدنیا ہو کر جب معرفت و حقیقت کی بنیاد
ڈالی تو استاد کی اس عظیم تبدیلی سے مرزا فدوی نے بھی بڑا گہرا اثر
قبول کیا۔ انہوں نے عشق کے عارفانہ رنگ کی تقلید کی جس کے
تانے بانے خواجہ میر درد سے ملتے ہیں۔ مرزا فدوی کے اس رنگ کے
کچھ اشعار دیکھئے۔" ۵

نظیر دنیا میں کون تیرا تجھے کوئی دے مثال کس کی
ترے مقابل کسی کو کیجئے یہ جان کس میں مجال کس کی

زبان پر نام ہے ہر آن تیرا
الٰہی شکر ہے احسان تیرا

نیرنگی تری وجہ پریشاں نظری ہے
ہر شئے میں جدی شان نئی جلوہ گری ہے

اور ان دو اشعار میں ہمہ اوست کے فلسفہ کو کس دلکش پیرائے میں بیان
کیا ہے ۵

ہے نقشہ کس سے حق کے سوا ممکنات کا
ہر فرد ہے جہاں میں آئینہ ذات کا
پر تو نہیں تجلی وحدت کا کس پہ یاں
لیکن بیان کس سے ہو اس واردات کا

فدوی نے اپنی ایک غزل میں بھی صوفیانہ خیالات کو اس طرح پیش

---

۵ مرزا محمد علی فدوی، ان کا عصر، حیات اور شاعری، مصنف ڈاکٹر سید محمد حسنین صـ ۲۷۲

کیا ہے ؎

ہے چشم سے منظور تو دیدار ہے تیرا — کچھ کام زباں سے ہے تو اقرار ہے تیرا
ہو جان بدن میں تو فدا ہونے کو تجھ پر — سینے میں رہے دل تو گرفتار ہے تیرا
آنکھوں میں جگہ ہے تو تصور ہی کو تیرے — ہے دل میں بھرا کچھ تو یہاں پیار ہے تیرا

شاہ کمال الدین حسین چشتیؒ

کمال الدین حسین نام، شاہ کمال چشتیہ عرف اور کمال تخلص ہے۔ یہ قادر نواز خاں کے فرزند ہیں۔ شاہ کمال کے والد کا وطن موضع محی الدین پور متصل دیورہ ضلع گیا ہے۔ اسی موضع میں شاہ کمال پیدا ہوئے۔ پیدائش کا سن معلوم نہیں ہے۔ البتہ شاہ کمال دیوروی کے ملفوظات جس کے جامع جمال حسین فردوسیؒ ہیں۔ اس مخطوطے سے یہ پتہ چلتا ہے کہ کمال حسین شاہ کمال علیؒ کے فن شاعری میں شاگرد تھے۔ مصحفی نے اپنے تذکرہ "تذکرۂ ہندی" میں انکے تفصیلی حالات لکھے ہیں۔ وہ لکھتے ہیں کہ:

"ان کی نشو و نما عظیم آباد میں ہوئی، جب آپ کے والد کا انتقال ہو گیا تو سولہ سال کی عمر میں گھر سے نکل کھڑے ہوئے اور قصبہ سلون پہنچے۔ (آج کل وہ ضلع رائے بریلی کا سب ڈویژن ہے) اور پیر شاہ کریم عطا فرزند و جانشین حضرت پیر شاہ اشرف قدس سرہٗ کی خدمت بابرکت میں حاضر ہو کر بیعت سے مشرف ہوئے اور درویشانہ حالت میں سیر و سیاحت کرتے ہوئے لکھنؤ پہنچے۔ اس وقت سے اب تک اسی شہر میں مقیم ہیں اور متوکلاً زندگی بسر کر رہے ہیں۔ راجہ بھولاس رائے نے

آپ کو سات برس سے اپنے مکان میں ٹھہرالیا ہے اور آپ کی خدمت کو وہ باعثِ سعادت سمجھتے ہیں اور آپ سے بخوبی پیش آتے ہیں۔ چونکہ شاہ کمال کو شعر و سخن سے طبعاً شوق ہے اور بچپن ہی سے آپ کی موزوں طبیعت کو اس کی فکر دامن گیر ہے اسی لیے آپ نے اساتذہ سلف و حال کے دیوان تیس سے زائد جمع کر لیے ہیں۔ اور ان کے کلام کی سیر کی برکت اور کاملوں کے فیض صحبت سے پایۂ اعتبار حاصل کر لیا ہے۔ ابتدا میں اپنا کلام محمد قائم کو دکھاتے تھے اور اب قلندر بخش جراُت سے مشورۂ سخن لیتے ہیں۔ آپ کے اخلاق درویشانہ ہیں اور طبیعت مرنج و مرنجان واقع ہوئی ہے۔ اکثر فقیر کے مشاعرے میں شریک ہوتے ہیں اور اس خاکسار کے کلام سے دلی اُلفت رکھتے ہیں۔ چنانچہ آپ نے میرے تینوں دیوانوں کو اپنے ہاتھ سے نقل کر لیا ہے۔ میرے تذکرۂ ہندی کو جو تیار ہو چکا ہے، خریداروں کے پاس لے گئے۔ غرض کہ جس طرح آپ کا نام کمال ہے، آپ کی ذات کمال مجسم ہے۔ اس وقت آپ کی عمر تیس سال سے زیادہ ہو گی۔"

نمونۂ کلام "تذکرۂ ہندی" سے ماخوذ ہے:۔

میں بندہ کیوں نہ ہوں اس کی ادا کا	عیاں اس بت میں ہے جلوہ خدا کا
ہم گدا دیکھتے ہیں اس بُتِ گمراہ کی راہ	یعنی آ نکلے تو کچھ مانگ لیں اللہ کی راہ

کھولے آنکھیں وقتِ آخر بھی ترا بیمار ہے	مرتے مرتے بھی اسے کیا حسرت دیدار ہے

شبِ وصال میں جب روزِ غم کی بات چلی	خروش مرغ سحر نے کہا کہ رات چلی
کچھ اور لے نہ چلے ہم تو اس جہاں سے کمال	ہمارے ساتھ فقط اک خدا کی ذات چلی

شیخ غلام یحییٰ حضور عظیم آبادیؒ

آپ کا اسم شریف غلام یحییٰ، عرف کجو اور تخلص حضور تھا۔ آپ شاہ محمد مظہر کے صاحبزادے اور محمد باقر کے بھتیجے تھے۔ آپ کی ولادت عظیم آباد میں ہوئی۔ لیکن سال ولادت کا پتہ نہ چل سکا۔ ابتدائی تعلیم اپنے چچا محمد باقر عظیم آبادی سے حاصل کی۔ علوم عربی و فارسی میں کافی مہارت رکھتے تھے۔ صرف و نحو کے بھی ماہر تھے۔ ذریعۂ معاش تجارت تھا لیکن اپنی عمر کے آخری حصہ میں طبابت کا پیشہ اختیار کر لیا تھا۔

آپ کو تصوف سے گہری دلچسپی تھی اس لیے کہ آپ کا گھریلو ماحول بھی صوفیانہ تھا۔ آپ سلسلۂ چشتیہ میں بیعت تھے مگر کس کے حلقۂ ارادت میں آئے یہ معلوم نہ ہو سکا۔ لیکن اتنی حقیقت ضرور ہے کہ آپ عظیم آباد کے ایک صاحب سلسلہ بزرگ تھے۔ ۱۱۹۱ھ میں ایک مثنوی بہ عنوان "مثنوی در تعریف درگاہ شاہ ارزاں" لکھی۔ اس کے علاوہ سلسلہ منعمیہ ابوالعلائیہ کے ایک مشہور صاحب سلسلہ بزرگ حضرت شاہ رکن الدین عشق قدس سرہٗ (متوفی ۱۲۰۳ھ) سے بھی انہیں کافی عقیدت تھی۔ آپ نے حضرت عشقؔ کے وصال پر ایک قطعہ تاریخ وفات بھی لکھا تھا جو ان کے مزار پر کندہ ہے ؎

امام زماں رکن دین کز وبود | بباغ جہاں آب و تاب طریقت
گزشت از جہاں و بتاریخ فوتش | رقم ساختم آفتاب طریقت

۱۲۰۳

شورش عظیم آبادی کے بیان کے مطابق آپ نے شاعری میں میر باقر حزیں کے سامنے زانوئے تلمذ تہ کیا۔ وہ لکھتے ہیں:

"شاعر اہل مقدور، شیخ غلام یحییٰ حضور، ساکن عظیم آباد مرد یست صاحب تمکین و مزاج گرفتہ الحال اوقات بسوداگری بسر می برد۔ در طبابت شاگرد میر علی اسماعیل مستمند نوم رفتہ و در فن شعر شاگرد

میر باقر حزیں غفرلہٗ امّا باعث کار دبار دنیاوی فکر شعر گاہ گاہ
می نماید۔" [1]

آپ کا وصال ۷ جمادی الآخر ۱۲۰۶ھ کو بوقت نماز جمعہ ہوا اور عظیم آباد ہی میں مدفون ہوئے۔ حضور کا تعلق چونکہ ایک صوفی خانوادہ سے تھا۔ اور وہ خود بھی ایک سلسلہ بزرگ تھے اس لیے اسلامی تصوف سے آپ کو گہری واقفیت تھی۔ اسی لیے آپ کی شاعری حقیقت و معرفت کے نکات ملتے ہیں۔ ایک غزل کے چند اشعار ملاحظہ کیجیے ؎

یہ دل ہی جلوہ گاہ ہے اس خوش خرام کا — دیکھا تو صرف نام ہے بیت الحرام کا
معنی میں لفظ ایک ہے یہ رب و رام کا — حاصل یہ ہے کہ ہے وہی حاصل کلام کا
دیکھا تو سب حقیقت و معنی میں ایک ہیں — صورت میں گرچہ فرق ہے آپس میں نام کا
اس لامکاں کا کوئی معین نہیں مکاں — گر ہے تو دل ٹھکانہ ہے اس کے مقام کا

حضور کے اشعار میں تصوف کے مصطلحات بھی آتے ہیں لیکن وہ بھی پردہ ہی پردہ میں ہیں جس کو پڑھ کر کیف و سرور سے ہمکنار ہوں، ملاحظہ ہوں ؎

آئینہ ہے یہ جہاں اس میں جمال اپنا ہے
صورتِ غیر کہاں ہے یہ خیال اپنا ہے

دیکھا تو ہر اک جا ہے حرم و دیر کہاں ہے
اللہ ہی اللہ ہے یہاں غیر کہاں ہے

اپنے ہی گھر میں خدائی جو کوئی سمجھے حضور
ہاں مگر قید خودی سے ٹک رہائی چاہیے

---

[1] تذکرہ شورش صفحہ ۲۱

حضرت شاہ نورالحق طپاںؔ پھلواروی رح

خانقاہ عمادیہ منگل تالاب، پٹنہ سیٹی بھی اپنے علم وفضل اور رشد وہدایت کی وجہ سے صوبہ بہار میں مشہور ومعروف ہے۔ یہ حضرت عمادالدین قلندر اور ان کے صاحبزادے حضرت غلام نقشبند سجاد کے داماد اور حضرت تاج العارفین پیر مجیب اللہ پھلواروی کے پوتے حضرت شاہ نورالحق طپاںؔ پھلواروی رح کی خانقاہ ہے۔

حضرت شاہ نورالحق طپاںؔ، تاج العارفین حضرت پیر مجیب اللہ رح کے بڑے صاحبزادے حضرت مولانا شاہ عبدالحق کے بڑے صاحبزادے ہیں اور حضرت خواجہ عمادالدین رح کے صاحبزادے حضرت غلام نقشبند سجاد کے داماد تھے۔

آپ کی ولادت باسعادت ماہ جمادی الاول ۱۱۵۶ھ میں پھلواری شریف ضلع پٹنہ میں ہوئی۔ درسی کتابیں اس عہد کے یگانۂ روزگار عالم ملا وحیدالحق ابدالی سے پڑھی۔ علوم ظاہری کی تکمیل کے بعد علوم روحانی کا شغف ہوا اور حلقۂ ارادت میں داخل ہونے کی تڑپ نے بھی زور کیا۔ بالآخر آپ حضرت پیر مجیب اللہ رح کے دست حق پرست پر بیعت ہوئے۔ ریاضت ومجاہدہ میں مشغول کئے گئے اور جب حضرت تاج العارفین نے مرید کو بامراد دیکھا تو اجازت وخلافت سے نوازا۔

چونکہ آپ خواجہ عمادالدین قلندر کے صاحبزادے اور حضرت غلام نقشبند سجاد رح کے داماد تھے۔ اس لیے جب حضرت غلام نقشبند سجاد کا وصال ۱۱۷۳ھ میں ہوا تو حضرت پیر مجیب اللہ رح نے اپنے پیرومرشد حضرت عمادالدین قلندر کی گدی پر آپ ہی کو صاحب سجادہ بنایا۔ اس طرح آپ سے حضرت عمادالدین قلندر کا بھی فیضان جاری ہوا اور حضرت پیر مجیب اللہ قادری کا بھی۔ آپ کی خانقاہ عمادیہ پھلواری سے رشد وہدایت کا فیضان جاری تھا کہ کچھ ناموافق حالات کے باعث آپ کو ضعیف العمری میں اپنا مولد ومسکن چھوڑنا پڑا اور پھلواری سے

عظیم آباد منتقل ہونا پڑا۔ چنانچہ آپ کی خانقاہ عمادیہ پھلواری سے منگل تالاب منتقل ہو گئی۔ اور ہنوز شاد و آباد ہے۔ ؎

آپ نے اپنی زندگی ہی میں اپنے صاحبزادے حضرت شاہ نور الحق طپاں کو اجازت و خلافت دے کر ۱۲۰۰ھ میں اپنی مسند سجادگی پر بیٹھا دیا اور خود گوشہ نشیں ہو گئے۔ ۴؍ شعبان المعظم ۱۲۳۲ھ کو خانقاہ عمادیہ منگل تالاب میں وصال فرمایا۔ آپ کا جنازہ پھلواری شریف لایا گیا اور لعل میاں کی درگاہ میں سپرد خاک کیے گئے۔

بچپن سے شاعری کا ذوق تھا بلکہ فطری لگاؤ تھا۔ طپاں تخلص فرماتے تھے۔ آپ نے کس کے سامنے زانوئے تلمذ تہ کیا۔ اس کا ابھی تک پتہ نہیں چلتا ہے۔ فارسی اور اُردو دونوں میں ذوق فرماتے تھے اور صاحب دیوان تھے۔ آپ کی فارسی غزلوں کے تین دیوان خانقاہ عمادیہ منگل تالاب میں موجود ہیں۔ اس کے علاوہ اُردو مراثی کا ایک ضخیم بیاض بھی خانقاہ مذکور میں موجود ہے۔ البتہ حضرت کی اُردو غزلیں محفوظ نہ رہ سکیں۔ ویسے کچھ مشہور غزلیں آپ سے منسوب ہیں۔ خاص کر یہ دو اشعار زبان زد خاص و عام ہیں ؎

اپنی کملی میں جب مگن ہیں طپاں
کام کیا شال سے دوشالے سے

تمنا ہے کہ ہر دم تیری صورت دیکھتے رہتے
تو ہوتا سامنے ہم تاقیامت دیکھتے رہتے

حضرت طپاں فطری اور صوفی شاعر تھے۔ ان کے فارسی اشعار سے یہ اندازہ ہوتا ہے کہ آپ کا کلام تصوف کے حقائق و معارف سے پُر ہے۔ "نقوش صبح" میں تحریر ہے:۔

"عنفوان شباب میں آپ کا کلام کسی نے علی حزیں کو بنارس میں دکھایا تھا۔ انہوں نے غزلوں کے ان اوراق پر یہ جملہ تحریر کر دیا تھا۔" ہمانا کہ

کلام خوب است و برخے ازاں مرغوب، اما بوئے پیرزادگی می آید۔
شاید کہ ان کو پیرزادگی کا گمان اس لیے ہوا ہو کہ کلام میں تصوف کا
رنگ گہرا تھا۔ آپ کے متعدد شاگرد تھے ان میں ممتاز اور صاحب
دیوان شاگردوں میں فرد الاولیاء حضرت شاہ ابوالحسن فرد کا نام
آتا ہے۔" [۱]

حضرت طپاںؔ کی مشہور غزل ہے۔

تمنّا ہے کہ ہر دم تیری صورت دیکھتے رہتے
تو ہوتا سامنے ہم تا قیامت دیکھتے رہتے

کیا سجدے میں لاکر مجھ کو کس نے کشتۂ حیرت
جو ہوتے بتکدے میں حق کی قدرت دیکھتے رہتے

غلام ان کا ہوں پھر کیوں کر نہ مجھ کو بخش دیتے وہ
وہ کن آنکھوں سے بیٹھے میری ذلّت دیکھتے رہتے

طپاںؔ ہم خود نہ ہوتے بیچ میں اور ان کی آنکھوں سے
لگائے ٹکٹکی وہ پیاری صورت دیکھتے رہتے

حضرت طپاںؔ کی ایک غزل کے چند اشعار ملاحظہ ہوں جن میں شاعر موصوف نے
اپنے صوفیانہ مذاق کا ثبوت پیش کیا ہے

تیرے عاشق تیرے شیدا کا یہ حال
ہائے کیسے تجھ سے دیکھا جائے ہے

منزل مقصود پا وے ہے وہی
جو ترے رستہ میں کھویا جائے ہے

اُٹھ رہا ہے درد دل جب بار بار
دل سے پوچھو کا ہے بیٹھا جائے ہے

اب بُلاوا آرہا ہے یار کا
دو قدم بھی جب نہ جایا جائے ہے [۲]

---

[۱] نقوش صبیح : ص ۲۴ مرتبہ متین عمادی و یادگار عشق ص ۵۱ مرتبہ ثاقب عظیم آبادی
[۲] بہار میں اُردو زبان و ادب کا ارتقاء ص ۲۹۶ مصنف ڈاکٹر اختر اورینوی

غلام علی راسخ عظیم آبادی

صوبۂ بہار میں اردو زبان کی ابتدائی نشو و نما تو قدیم ہے لیکن اردو شاعری کی قدامت جنوبی ہند کے بعد ہی نظر آتی ہے۔ راسخ عظیم آبادی اردو شاعری میں طرۂ امتیاز کے حامل رہے ہیں۔ آپ کا نام شیخ غلام علی اور راسخ تخلص ہے۔ آپ کی پیدائش ۱۱۶۲ھ مطابق ۱۷۴۹ء میں اپنے وطن مالوف موضع سائیں ضلع پٹنہ میں ہوئی۔ راسخ بچپن ہی سے عظیم آباد میں آکر حصول تعلیم میں مشغول رہے اور تحصیل علوم کے بعد مونگیر، بھاگل پور، مرشد آباد، کلکتہ اور دہلی کا سفر کیا تھا اور دہلی میں میر تقی میر کی خدمت میں بھی حاضر ہوئے۔ راسخ اردو شاعری کے جلیل القدر شاعر ہیں۔ مثنوی نگاری میں بھی ید طولیٰ رکھتے ہیں۔ اور غزل گوئی میں تو مسلم الثبوت استاد تسلیم کیے جاتے ہیں۔ قاضی عبدالودود صاحب کا خیال ہے کہ راسخ بحیثیت مجموعی بہار کے قدیم شعرائے اردو میں سب سے بڑے ہیں۔ یہ ابتداء میں اپنے استاد فدوی جو کہ رکن الدین عشق دہلوی کے شاگرد اور مرید تھے، سے اپنے کلام پر اصلاح لیا کرتے تھے۔ جس کے ثبوت میں راسخ کا یہ شعر ہے ؎

شاگرد ہیں گے حضرت فدوی کے بے شمار
راسخ ہوں ایک میں بھی و لے کس شمار میں

لیکن آخر میں میر تقی میر کا انداز انہیں زیادہ پسند آیا اور میر تقی میر سے مشورۂ سخن کے لیے وہ لکھنؤ تشریف لے گئے۔ عشقی نے لکھا ہے کہ:

> "راسخ کو میر سے بڑی عقیدت تھی اور ان کی کشش ان کو لکھنؤ لے گئی جہاں وہ میر کے حلقۂ تلامذہ میں داخل ہوئے۔" [1]

---

[1] بہار میں اردو زبان و ادب کا ارتقاء

لوان راسخ میں ایسے مقطعے بھی ہیں جن میں انہوں نے اپنی شاگردی کا اعتراف کیا ہے اور میر کی شاگردی پر انہیں فخر ہے۔ ملاحظہ ہو ؎

راسخ کو ہے میر سے تلمذ
یہ فیض ہے ان کی تربیت کا

اور راسخ کو اپنی شاگردی پر فخر بھی تھا وہ کہتے ہیں ؎

زندہ ہے نام میر، راسخ سے
کون ہے شاعروں میں ایسا آج

راسخ اردو مثنوی میں مثنوی نگار کی حیثیت سے اور غزل میں غزل گو کی حیثیت سے عظیم المرتبت شاعر ہیں۔ انہیں ثانی میر کہا جاتا ہے۔ ان کے کلام میں میر کا رنگ و آہنگ اور ان کے کلام کا سوز و گداز نمایاں ہے لیکن استاد سے تصوف کے میدان میں آگے بڑھ گئے ہیں۔ اگرچہ وہ غزل کے اعتبار سے بہت مشہور ہوئے اور یہ میر تقی میر کا ہی فیض ہے لیکن راسخ کی غزلوں میں تصوف کی چاشنی بھی ہے اور یہم آہنگی بھی جو ان کو صوفی شاعر کی حیثیت سے ایک نمایاں مقام بخشتی ہے۔

آپ کا انتقال ۱۲۳۳ھ میں عظیم آباد ہی میں ہوا اور پٹنہ سیٹی کے محلہ لودی کٹرہ میں آپ کی آخری آرام گاہ بنی۔

راسخ کے کلام میں میر تقی میر کا رنگ و آہنگ دیکھئے ؎

صبح سے بیتابی ہے دل کو آہ نہیں کچھ بھاتا ہے
دیکھئے کیا ہو شام تلک جی آج بہت گھبراتا ہے

مت پوچھے مجھ سے حال مرا حیرت زدہ کیا بیان کرے گا
آپ سے ہو گئے بیگانے جن سے ٹک آشنا ہوئے تم

؎ جز داغ ہے کیا دلِ حزیں میں
لالہ ہی اُگے ہے اس زمیں میں

لیکن جب راسخ تصوف کے میدان میں قدم رکھتے ہیں تو ان پر دوسری ہی کیفیت طاری ہو جاتی ہے اور اس کا رنگ صوفیانہ ہو جاتا ہے۔ ان اشعار کو ملاحظہ کیجیے:

؎ طالبان راہ کی منزل تو غیر از دل نہیں
کعبہ کہتے ہیں جسے سو راہ ہے منزل نہیں

اٹھا دیں کس روش اس باغ دلکش سے دل اپنا ہم
کہ ہر کانٹے سے یاں اُلجھا ہوا اپنا تو داماں ہے

تسلیم و رضا کا یہ شعر ملاحظہ کیجئے جو تصوف کی خاص روش اور تعلیم ہے ؎

تم سے کچھ بندہ نے چاہا تو تم ہی کو چاہا اور کیا مانگتا کس چیز کا سائل ہوتا

قطع رہِ دشوار محبت نہیں آساں پیش آوے یہاں مسئلہ تسلیم و رضا کا

اور اس شعر پر ذرا توجہ دیجئے ؎

اگر باب اجابت تک رسا ہوتی دعا اپنی
کہ جی میں تھا کہ خواہانِ دلِ بے مدعا ہوتے

راسخ کی غزل میں رنگ تغزل بھی ہے اور آہنگ تصوف بھی۔ وہ عملی طور پر صوفی شاعر ہوں یا نہ ہوں لیکن علمی طور پر تو وہ شاعر تصوف کی حیثیت سے عظمت کے حامل ہیں۔ راسخ کی اس غزل کو ملاحظہ کیجیے جس میں تصوف کے نکات کو وہ مختلف انداز میں پیش کیا ہے ؎

بسکہ ڈھونڈے اہلِ دل مل اُن سے صاحب دل ہوا
جب پھرا میں برسوں تب یہ آبلہ حاصل ہوا

وہ گدا دولت کہن ہیں جس کے سو ہیو نہ تھا
جا سکندر اس سے ہفت اقلیم کا سائل ہوا

دیکھ مجنوں کے تئیں ٹک اور بارِ عشق دیکھ
سخت حیرانی ہے تنکا کوہ کا حامل ہوا

ابتدائے عشق ہی میں بے تہی کی شوق نے
دل مرا سینہ میں پر بیتاب و مستعجل ہوا

امتحانِ مخصوص خاصاں ہے تو راسخ شکر کر
یار تیرے آزمانے کی طرف مائل ہوا

مذکورہ بالا غزل میں راسخ نے اہلِ دل، مجنوں، عشق کی حقیقت کو بیان کیا ہے۔ لیکن دوسری غزل میں شاعر کا انداز اچھوتا ہے اور اس کا خیال عاشقانہ لب و لہجہ لیے ہوئے صوفیانہ ہے، ملاحظہ ہو ؎

مدعا عالم سے اپنا ہی فقط دیدار تھا
دید کو اپنی یہ آئینہ اسے درکار تھا

دل سے آگے کیوں بڑھا لوائے طلبگار وصال
پھر ادھر ہی وہی گھر جلوہ گاہ یار تھا

کفر بھی اک شان جلوے اوسی دلبر کی ہے
شیخ کیوں تو برہمن سے برسر انکار تھا

دل ہوس والوں کے محروم اس کے پرتو سے رہے
جلوہ گاہ داغ جاناں سینۂ ابرار تھا

سراج اورنگ آبادی کی ایک غزل اس بحر اور انداز میں بڑی کامیاب تسلیم کی جاتی ہے۔ راسخ نے بھی صوفیانہ رنگ و آہنگ میں یہ غزل پیش کی ہے۔

نگراں کبھو نہ یہ جانب رخ دلفریب پری رہی
مری چشم تا نگہ بسیں تری محو جلوہ گری رہی

تمہیں گل کی جس نے بنایا تو کہا اس نے مجھ کو صبا ہے تو
رہے تم تو پردہ نشیں سدا مجھے آہ در بدری رہی

نہیں ہوش والوں پہ کچھ حسد مجھے رشک ہے تو ادنہوں پہ ہے
جنھیں تیرے جلوہ کے سامنے مری طرح بے خبری رہی

یہ جواب ہے آخر عاشقی کبھو ہوش ہے کبھو رفتگی
نہ وہ گریۂ دل شب رہا نہ وہ زاری سحری رہی

نہ تھی چشم راسخ خستہ دل کبھو خالی اشک سے دوستاں
شب و روز جام پر آپ کی روش آنسوؤں سے بھری رہی

حضرت شاہ ابوالحسن فردؔ پھلواروی

حضرت شاہ ابوالحسن فردؔ پھلواروی حضرت پیر مجیب اللہ قادری پھلواروی کے پوتے اور شاہ محمد نعمت اللہ قادری پھلواروی کے خلف اکبر، جانشین اور سجادہ نشین خانقاہ مجیبیہ تھے۔ آپ کا خطاب فرد الاولیاء ہے اسی وجہ سے آپنے اپنا تخلص فردؔ فرمایا۔ آپ کی ولادت باسعادت ۱۱۹۱ھ کو پھلواری شریف میں ہوئی۔ آپ کی ابتدائی تعلیم والد ہی سے ہوئی۔ اس کے بعد آپ کی تکمیل حضرت سید العلماء مولانا احمدی صاحب سے ہوئی جو اپنے عہد کے جید عالم تھے۔ آپ کی تمنا تھی کہ حضرت شاہ عبدالعزیز محدث دہلوی رحمۃ اللہ علیہ سے بھی درس حدیث لیں لیکن خانقاہ کی مصروفیت اور خدمت کے باعث یہ تمنا حسرت بن کر رہ گئی۔ ۱۲۴۷ھ میں آپ کے والد کا انتقال ہوگیا تو مسند سجادگی پر جلوہ افروز ہوکر خدمت خلق میں مشغول ہوگئے۔ آخر ۲ محرم الحرام ۱۲۶۵ھ کو اپنے معبود حقیقی سے جا ملے اور اپنے آبائی مدفن میں مدفون ہوگئے۔

آپ فطری شاعر تھے۔ اس لیے بچپن ہی سے شعر و شاعری کا شوق رہا۔ آپ اپنے چچا زاد بھائی حضرت نور الحق طپاںؔ سے مشورۂ سخن لیتے رہے۔ خداداد ذہانت تھی۔ اس لیے سعدیؔ، خسروؔ، حافظؔ، جامیؔ اور عرفیؔ کے کلام کا مطالعہ کرکے ان کے انداز شاعری کو بھی اخذ کیا۔ حقیقت یہ ہے کہ حضرت فردؔ پھلواروی فارسی کے قادر الکلام شاعر تھے۔ بعض غزلوں کے مطالعہ سے یہ اندازہ ہوتا ہے کہ حافظ شیرازی کا رنگ غالب ہے۔ بلکہ حافظ کے کلام کا شبہ بھی پیدا ہوجاتا ہے۔ آپ کے فارسی کلام کا مجموعہ "کلیاتِ فردؔ" کے نام سے ۱۲۶۳ھ میں زیور طبع سے آراستہ ہوچکا ہے جو بہت ہی مشہور و مقبول ہوا۔ اس میں غزلیں، رباعیات، قصیدہ اور مثنویاں بھی ہیں۔

آپ کا شمار اساتذۂ وقت میں ہوتا ہے۔ صرف فارسی شاعری ہی پر آپ کو کمال حاصل نہیں تھا بلکہ اُردو میں بھی طبع آزمائی کرتے تھے اور اس کے بھی قادر الکلام شاعر تھے۔ زبان میں صفائی بھی ہے اور نازک خیالی بھی۔ یہی وجہ ہے کہ مولٰنا احمد اللہ ندوی لکھتے ہیں :-

"راقم کہتا ہے کہ حضرت فردؔ کی اردو شاعری بھی اپنی ندرت خیال، بندش الفاظ اور اپنے اسلوب بیان کے لحاظ سے لاجواب ہوتی تھیں اور آپ کا اُردو کلام صوبہ بہار میں اپنے معاصرین پر فوقیت رکھتا تھا۔" ؎

آپ کا اُردو کلام کمیاب اور مختصر ہے لیکن جو کچھ بھی ہے اس میں تصوف کی جلوہ گری ہے اور تغزل کا رنگ بھی۔ آپ کے یہ دو اشعار بہت مشہور ہیں ملاحظہ ہو

؎ دل جسے کہتے تھے وہ ایک آبلہ تھا بہ گیا
نام کو اب زخم سا داغِ نمایاں رہ گیا

فردؔ کی کیا خوب حالت عشق میں پہنچی ہے اب
جس کے جو کچھ جی میں آیا منہ پہ آکے کہہ گیا

فردؔ کی مندرجہ ذیل غزل میں ان کے صوفیانہ خیالات کی اثر آفرینی دیکھئے ؎

جسے تم غیر سمجھے ہو اسے ہم یار کہتے ہیں
جہاں کو ہم سراسر جلوۂ دلدار کہتے ہیں

نہ ہو جس گل میں تیری بُو اسے ہم خار کہتے ہیں
جہاں تو جلوہ گر ہووے اسے گلزار کہتے ہیں

سند منصور کی ہے یہ ہمیں راہِ محبت میں
سرِ دار آئے جس کا سر اسے سردار کہتے ہیں

اگر دل صاف ہے کب کوئی ہے دیدار کا مانع
جو ہووے سدِ راہِ یار اسے دیوار کہتے ہیں

نہیں ہے اپنا شیوہ شاعری کا فردؔ پر ہم نے
کیا نذر نیاز ان کی جو بولے اشعار کہتے ہیں

آپ کا وصال ۱۲۶۵ھ مطابق ۱۸۴۸ء میں ہوا اور پھلواری شریف میں مدفون ہوئے۔

لہ تذکرۂ مسلم شعرائے بہار حصہ سوم ص ۲۱۷

حضرت آشنا پھلواروی

حضرت پیر مجیب اللہؒ کی عظمت و بزرگی اپنی جگہ مسلم ہے لیکن اس خاندان کا بڑا کمال یہ بھی ہے کہ اس کے جتنے افراد تھے سب علم و ادب کے پرستار تھے۔ فارسی اور اُردو دونوں زبانوں سے شغف تھا۔ چنانچہ آشنا پھلواروی بھی اسی خاندان کے ایک باعظمت بزرگ اور صوفی شاعر ہیں۔ آپ کا اسم شریف ابوتراب اور تخلص آشنا ہے۔ آپ حضرت پیر مجیب اللہؒ کے صاحبزادے شاہ منت اللہ کے بیٹے تھے یعنی حضرت پیر مجیب اللہؒ کے پوتے ہوئے۔

آپ کی ولادت باسعادت ۱۱۹۲ھ میں اپنے وطن مالوف پھلواری شریف میں ہوئی۔ آپ نے علوم ظاہری کی تعلیم اپنے خاندان کے ایک باعظمت بزرگ سید العلماء مولانا احمدیؒ سے حاصل کی۔ اور علوم باطنی کی تکمیل حضرت شاہ نعمت اللہ پھلواروئیؒ سے ہوئی اور ۱۲۱۶ھ میں آپ سے مرید بھی ہوئے۔ آپ نے علم فقہ میں بھی چند رسائل لکھے ہیں جو مخطوطہ کی شکل میں کتب خانہ خانقاہ مجیبیہ پھلواری شریف کی زینت ہے۔ ۱۲۷۰ھ میں آپ کا وصال ہوا۔ اور اپنے خاندانی قبرستان میں مدفون ہوئے۔

آشنا اردو فارسی دونوں کے قادرالکلام شاعر تھے اور تصوف میں آپ کو کامل دستگاہ حاصل تھی اور یہ رنگ آپ کی شاعری پر بھی غالب تھا۔ اسی لیے آپ صوفی شاعر کی حیثیت سے مشہور ہوئے۔ آشنا کی ایک غزل بہت مشہور ہے جس میں رنگ تغزل بھی ہے اور آہنگ تصوف بھی ملاحظہ کیجئے ؎

سر ہے اپنا اور تیغ یار، ہونی ہو سو ہو

جاں رہے یا جائے اب کی بار ہونی ہو سو ہو

گر نہ رہنے پائیں اس کوچے میں لیکن جائیں گے

جب تلک ہے طاقتِ رفتار، ہونی ہو سو ہو

ہم سے کوئے یار کا جانا نہ چھوٹے گا کبھی

جو ستم چاہیں کریں اغیار، ہونی ہو سو ہو

آشنا سہنا جفا اغیار کی پر ہاتھ سے

چھوڑ نہ دامنِ دلدار، ہونی ہو سو ہو [1]

ایک اور غزل ہے جس میں تغزل کا رنگ ہے اور تصوف کی ایمائیت ملاحظہ کیجیے

کیا کہا تو نے صبا کہہ تو، چمن میں کیوں آج

غنچے کو تنگ دلی گل کو پریشانی ہے

تیری ہی آنکھوں میں ہم خار ہیں زاہد ورنہ

بزمِ رنداں میں مری خوب قدردانی ہے

ہاتھ سے عشق کے بچنے کی تو اُمید نہیں

سینہ افگار ہے دل خوں ہے جگر پانی ہے

آشنا دیدہ و دانستہ دیا تو نے دل

اب شکایت ستم یار سے نادانی ہے

---

[1] تذکرہ مسلم شعرائے بہار حصہ اول ص ۲۷

حضرت سید شاہ امیر الدین وجدؔ

بہار شریف دینی اور روحانی اعتبار سے متبرک اور مقدس مقام سمجھا جاتا ہے۔ اس لیے کہ اس سرزمین میں اکابر اولیائے کرام اور صوفیائے عظام کی خانقاہ جہاں پناہ، رشد و ہدایت اور تصنیف و تالیف کے لیے مشہور و معروف تھی۔ اسی سرزمین میں حضرت مخدوم جہاں شیخ شرف الدین احمد یحییٰ منیریؒ کی ذات مقدس رشد و ہدایت کے لیے مشغول بحق رہی اور آپ ہی کی نظر خاص اور تعلیم روحانی سے حضرات بلخیہ نے بھی تصنیف و تالیف کی حیثیت سے جماعت صوفیاء میں اپنا خاص مقام بنایا۔ حضرت امیر الدین وجدؔ حضرت مخدوم جہاں کی اولاد میں سے ہیں اور آپ ہی کی خانقاہ میں رشد و ہدایت کے فیوض و برکات سے ایک جہاں کو فیضیاب کرتے رہے۔ آپ حضرت مخدوم جہاںؒ کی پوتی بی بی بارکہ کی اولاد میں سے ہیں۔

آپ حضرت شاہ ولی اللہ بن علیم الدین کے صاحبزادے تھے۔ آپ کی ولادت باسعادت ۱۲۱۳ھ مطابق ۱۷۹۸ء میں خانقاہ عالم پناہ بہار شریف میں ہوئی۔ ابتدائی تعلیم و تربیت اپنے بزرگوں کے زیر سایہ ہوئی۔ تکمیل تعلیم بھی بہار شریف کے علمائے روزگار سے ہوئی۔ آپ کی ابتدائی زندگی غیر محتاط اور عیش پرست تھی۔ آزاد روش اختیار کیے ہوئے تھے لیکن جب آپ حضرت شاہ حسین عطا شطاریؒ کے دست حق پرست پر بیعت ہوئے تو آپ کی زندگی بالکل بدل گئی۔ اور طلب حق کی طرف ہمہ تن متوجہ ہوئے جیسا کہ مصنف ''تذکرہ مسلم شعرائے بہار'' نے لکھا ہے، وہ لکھتے ہیں:

> ''اوائل حال میں عیش و طرب کی زندگی پر طلب فنا کہتی تھی کہ آپ کا قدم، جادۂ شریعت اور احتیاط سے پرے ہے۔ رفتہ رفتہ

سعادت ازلی نے ہاتھ پکڑا اور عین شباب میں توبۂ نصوح نصیب
ہوئی یعنی حضرت شاہ حسین عطا شطاری قدس سرہ کے دستِ حق پرست
پر سلسلہ فردوسیہ میں بیعت طریقت حاصل کرکے راہِ طلب حق کو
اختیار کیا اور کمالات باطنی سے آراستہ ہوکر جمیع سلسلۂ پیران سلاسل
کے مجاز ہوئے۔" [1]

آپ کو حضرت شاہ ابو الحسنؒ بن حضرت شاہ ابوالبرکات ابوالعلائیؒ اور
حضرت حمید الدین راج گیری سے بھی ارشاد طریقت حاصل تھا۔ گیارہ سال کی
عمر سے ہی شعر و سخن کا ذوق پیدا ہوا۔ فارسی میں دستگاہ حاصل کی۔ اس لیے
پہلے فارسی میں شاعری کی اس کے بعد اردو میں بھی ذوق شعری کو پروان چڑھایا۔ فارسی
میں ظلوم تخلص تھا اور اس میں علی حزیں کا رنگ پسند تھا۔ اردو میں وجد تخلص تھا۔
آپ نے کسی سے اصلاحِ سخن نہ لی۔ آپ فطری شاعر تھے۔ تصوف سے گہرا لگاؤ تھا۔
اس لیے آپ کے کلام میں حقائق و معارف کا گہرا امتزاج ہے۔ آپ کا وصال ۱۲۸۷ھ
مطابق ۱۸۶۶ء میں ہوا۔ بڑی درگاہ بہار شریف میں مدفون ہوئے۔ آپ کا مزار
مبارک زیارت گاہ خاص و عام ہے۔ آپ کے بعد مسند سجادگی پر آپ کے فرزند و
جانشین جناب حضور شاہ امین احمد شوق بہاری جلوہ افروز ہوئے۔ حضرت وجد
کے یہاں صوفیانہ خیالات بڑے دلکش پیرائے میں پائے جاتے ہیں۔

تصوف میں عشق و سرمستی کی بڑی اہمیت ہے اس لیے کہ اسی سے منازل
سلوک طے ہوتے ہیں۔ اس کیفیت کو حضرت وجد کے اشعار میں دیکھیے ؎

ہمارے دل سے بھی کو بکو پھرتا — صبا کی طرح رہا میں بھی اس گل کی جستجو نہ گئی
مجھے بھی تیرے رہ عشق میں ہے زور کی پیاس — کہ آبِ تیغ سے بھی خشکیٔ گلو نہ گئی

اور فقر و غنا کا فلسفہ وجد کے اشعار میں اس طرح بیان کیا گیا ہے ؎

---

[1] تذکرہ مسلم شعرائے بہار صفحہ ۱۲۹ حصہ پنجم

ہاتھ آتی نہیں زنہار فقیری میں غنا — تا نہ دل پائے بڑا مانِ قناعت رہیے
کعبۂ دل ہی عجب قبلۂ حاجات ہے شیخ — سر جھکائے یہاں مصروف عبادت رہیے

صوفی شاعری کی حیثیت سے حضرت وجد ایک منفرد مقام کے مالک ہیں۔ اس لیے ان کی شاعری میں صوفیانہ نقطۂ نظر تنوع کے ساتھ ہے۔ ان کے یہاں میر کا درد و سوز بھی ہے اور درد کا تصوف بھی۔ حضرت وجد کی شاعری کے سلسلے میں ڈاکٹر کلیم احمد عاجز اس طرح رقم طراز ہیں:۔

"حضرت وجد شعر و سخن میں کسی کے شاگرد نہیں۔ ان کی مشق کسی استاد کی رہبری کی مرہون منت نہیں۔ اس لیے مزاج میں بڑا تنوع ہے کبھی فارسی کے تتبع میں خارجیت کی رو میں آتے ہیں تو دور تک بہتے چلے جاتے ہیں۔ مضمون آفرینی کی طرف آتے ہیں تو فکر و فلسفہ کا سمندر اُبل پڑتا ہے۔ عشق و مستی بھی ہے، رندی اور شاہد پرستی بھی ہے، شاہی اور امیری بھی ہے، قلندری اور فقیری بھی ہے، دنیادار بھی ہیں اور دنیا سے بے نیاز بھی، دیوانہ و چاک گریباں کبھی، ہوشیار سازو ساماں بھی، رند اور محتسب بھی ہیں، ناصح اور مشفق بھی، صوفی اور شرابی بھی۔ حضرت وجد کے یہاں تجربات کی گوناگونی اور مشاہدات کی بوقلمونی ہے۔ جذبات و احساسات کا تنوع ہے۔" [1]

وجد کی اس غزل میں تصوف کی حقیقت کو دیکھیے

ذلتِ عشق کو سمجھے ہوئے عزت رہیے
کتنا ہی اس کے سبب باب مذلت رہیے
گر حقیقی نہیں بے لوث مجازی ہی سہی
رہ گئے عشق سے پیدا کسی بابت رہیے

---

[1] تحقیقی مقالہ (مخطوطہ) ص ۱۴۷ از ڈاکٹر کلیم احمد عاجز

مذہبِ عشق سے وسعت نہیں رکھتا کوئی
اختیار اس کا کیے مذہب و ملت رہیئے
دوستی ہی کا پڑھے راہ طلب میں ہر گام
آشنائی کے بس آوارۂ غربت رہیئے
لاگ سے لاگ رہے دل کو بہر حال اے وجد
سوز با ساز ہیں جس حال ہیں حضرت رہیئے

حضرت مجیب الحق کمالی فردوسیؒ

حضرت مخدوم شاہ شعیب رحمۃ اللہ علیہ کا فیضان دُور دُور تک پہنچا۔ آپ کے مریدو مجاز حضرت اسحاق مغربی ہیں۔ ان کے مرید و خلیفہ حضرت مخدوم شاہ برہان الدین عرف خوندمیاں دیلوروی ہیں جن کا سلسلۂ نسب بواسطہ حضرت مخدوم جلال الدین کبیرالاولیاء پانی پتی علیہ الرحمۃ خلیفہ ثالث حضرت امیرالمومنین سیدنا عثمان غنی رضی اللہ عنہ سے جا ملتا ہے۔ حضرت مخدوم شاہ برہان الدینؒ موضع دیورہ ضلع گیا میں رشد و ہدایت پر مامور کیے گئے۔ وہاں خانقاہ کی بنیاد ڈالی اور اس سے سلسلہ رشد و ہدایت کو فروغ ہوتا رہا۔ آپ کی اولاد میں حضرت شاہ جاراللہؒ تھے۔ آپ اپنے اہل و عیال کے ساتھ رسلہ منتقل ہو گئے جو علماء کی ایک قدیم بستی تھی۔ حضرت کے پرپوتے حضرت احمد کبیرالحسن شہید فردوسیؒ تھے۔ آپ کا عرف حضرت اعلیٰ تھا۔ حضرت شاہ مجیب الحق کمالی فردوسی آپ ہی کے بڑے صاحبزادے اور جانشین ہیں۔

آپ کا اسم شریف مجیب الحق اور تخلص کمالی ہے۔ آپ کی ولادت باسعادت ۱۲۸۰ھ میں رسلہ ضلع گیا میں ہوئی۔ آپ کے والد حضرت شاہ احمد کبیر ابوالحسن شہید بن قطب العصر حضرت مولانا شاہ محمد علی فردوسی تھے جو اپنے خاندانی

مسند سجادگی پر بیٹھ کر رشد و ہدایت کی تعلیم دیتے رہے۔ حضرت کمالی کی ابتدائی تعلیم گھر ہی پر ہوئی لیکن عربی و فارسی کی اعلیٰ تعلیم کے لیے دیورہ تشریف لے گئے اور مولانا عبدالجبار بڈوسری سے فقہ پڑھی تھی۔ طب کی تعلیم حکیم رضا حسن خاں صاحب سے حاصل کی اور حکیم ریاض علی سہسرامی سے بھی انہوں نے علم تشخیص سیکھا اور سہسرام ہی میں رہ کر طبابت کے فرائض انجام دیتے رہے۔ حضرت کمالی فردوسی کو آپ کے والد حضرت احمد کبیر ابوالحسن شہیدؒ نے علم باطنی سے سرفراز کیا اور مرید کر کے اجازت و خلافت سے بھی نوازا اور آپ کے بعد مسند سجادگی پر جلوہ افروز ہوئے اور سلسلہ فردوسیہ کی ترویج و توسیع میں سرگرم عمل رہے۔ حضرت کمالی فردوسیؒ کو شعر و شاعری کا بھی ذوق تھا۔ استاد کی تلاش تھی اس لیے آپ نے تلمذ کا سلسلہ غالب دہلوی سے وابستہ کیا۔ یعنی غالب کے شاگرد باقر گیاوی کے سامنے زانوئے تلمذ تہ کیا اور انہیں سے اصلاحِ سخن لیتے رہے۔ چنانچہ باقر گیاوی کے "دیوانِ باقر" میں بھی حضرت کمالی کا تذکرہ ہے۔ آپ کا وصال ۱۳۳۶ھ میں سہسرام میں ہوا اور اپنے خاندانی مدفن میں آسودہ ہیں۔ [۱]

حضرت کمالی ایک خانقاہ کے سجادہ نشیں، صوفیٔ باصفا اور صاحب دل شاعر تھے۔ آپ نے نعت، حمد، منقبت اور غزلوں پر طبع آزمائی کی ہے۔ یہ زیادہ تر فارسی زبان میں ہیں۔ اردو زبان میں بھی بہت کچھ کہا تھا مگر افسوس کہ وہ سرمایہ محفوظ نہ رہ سکا۔ کمالی کے یہاں تصوف کی دھیمی دھیمی آنچ ہے ملاحظہ ہو ؎

ایک مشت خاک تھا وہ بھی تو مٹی میں ملا
پوچھتے ہو کیا مرا نام و نشاں کچھ بھی نہیں
عمر کو جانو غنیمت اے کمالی مل تو لو
ہم کہاں اور تم کہاں یہ دم کہاں کچھ بھی نہیں

---

[۱] رسالہ زبان و ادب، سہ ماہی، بہار اردو اکاڈمی پٹنہ، جولائی ۱۹۸۲ء ص ۱۰۳
مقالہ شاہ ارشاد عثمانی "مولانا شاہ مجیب الحق کمالی"

آپ کی ایک مشہور غزل بڑی مقبول مشہور رہے اور چونکہ وہ محفل سماع میں سنائی جاتی رہی اسی لیے اسے شہرت دوام حاصل ہے۔ اس میں حافظ شیرازی کا وہ طربیہ اور نشاطیہ انداز منعکس ہے، جو کیف و سرور کی ایسی فضا پیدا کرتا ہے کہ اہلِ محفل تڑپ تڑپ کر بے حال ہو جاتے ہیں، ملاحظہ ہو ؎

مئے رہے مستی رہے گردش میں پیمانہ رہے
مجمعِ رنداں رہے اور پیرِ میخانہ رہے

دور ہوئے شراب و شوق و ساقی مست ناز
صدر مجلس خود رہے اور جوش مستانہ رہے

جبہ و دستار رہنِ مئے رہے ساغر بکف
محتسب بھی مست ہو ہوشیار دیوانہ رہے

مئے پلا ایسی کہ ساقی تیرے ہی رخسار کا
محو نظارہ رہوں اندازِ رندانہ رہے

ہے خراب بادۂ ساقی کمالی کی دعا
حشر تک یا بوالحسن آباد میخانہ رہے[1]

حسرت عظیم آبادی

شمس العلماء مولانا محمد سعید حسرت عظیم آبادی صوبۂ بہار کے وہ گراں قدر علمی شخصیت ہیں جن کا معترف ایک زمانہ ہے۔ طبقہ شعراء اور علماء اور ادبا میں ممتاز اور معروف ہیں۔ آپ کی ذات جامع کمالات تھی۔ ظاہری اور باطنی دونوں علوم سے متصف تھے۔

---

[1] زبان و ادب، سہ ماہی بہار اردو اکاڈمی، پٹنہ ص ۱۰۶

طبقۂ صوفیاء میں بڑی عظمت کے حامل ہوئے ۔ آپ کا اسم شریف محمد سعید اور حسرت تخلص ہے ۔ آپ کے والد منشی واعظ علی صاحب تھے ۔ آپ کی ولادت باسعادت ۱۲۳۱ھ میں ہوئی ۔ ابتدائی تعلیم اپنے والد سے حاصل کی پھر علم کے شوق میں وطن کو خیر باد کہہ کر کان پور تشریف لے گئے ۔ مولانا شاہ سلامت اللہ صاحب سے حصول تعلیم کی ۔ وہاں مفتی ظہور اللہ فرنگی محلی سے بھی تبرکاً کچھ کتابیں پڑھیں ۔ آپ کمسنی میں مرزا حسن علی محدث لکھنوی سے مرید ہو گئے تھے ۔ قیام کان پور کے دوران حضرت شاہ نذر محمد صاحب سے علوم باطنی کی تعلیم ہوئی اور اجازت وخلافت سے نوازے گئے ۔ جب آپ حج بیت اللہ کے لیے تشریف لے گئے تو آپ نے وہاں بھی دو ممتاز بزرگ سے سند حدیث حاصل کیا ۔ ایک حضرت مفتی سید احمد دحلان اور دوسرے محمد علی بن سنوسی الحسنی الخطابی ۔ حضرت مفتی صاحب کی تصانیف علمائے احناف میں خاص پایہ رکھتی ہیں ۔ دوسرے بزرگ وہ ہیں جن کا فیض اس وقت عرب سے لے کر طرابلس الغرب تک جاری ہے ۔ اس دور کے مشہور بزرگ شیخ سنوسی کے خلیفہ ہیں ۔

حضرت حسرت عظیم آبادی ۱۲۶۴ھ میں زیارت حرمین شریف سے فارغ ہو کر عظیم آباد آئے اور اپنی ساری عمر تعلیم وتدریس میں گزاری ۔ بڑے بڑے علمائے فن اور علمائے ادب آپ کے حلقۂ شاگردی میں داخل ہوئے ۔ شوق نیموی جیسے کامل فن ادب جوہر شناس بھی آپ کے سامنے زانوئے ادب تہ کیا اور اصلاحِ سخن لیتے رہے ۔ آپ کے زیادہ تر اوقات درس وتدریس، ہدایت وتلقین اور اوراد ووظائف میں گذرتے تھے ۔ آپ کو شمس العلماء کا خطاب بھی ملا تھا ۔ ۱۳۰۸ھ میں وصال فرمایا آپ اپنے مکان کے قریب محلہ مغل پورہ میں مدفون ہوئے ۔ آپ کی متعدد تصانیف ہیں ۔ جس میں عقائد اور فقہی مسائل اور روحانی تعلیمات کے مباحث ہیں ۔ آپ فطری شاعر بھی تھے اور آپ کی شاعری میں صوفیانہ رنگ وآہنگ بھی تھا ۔ نمونۂ کلام پیش خدمت ہیں جن سے اس حقیقت کی ترجمانی ہوتی ہے ۔ ملاحظہ کیجئے ؎

بہے ہیں اشکِ خوں رشکِ حنائے یار پر کیا کیا
پسے عشاق کے دل دست و پائے یار پر کیا کیا
دکھا کر اپنا جلوہ کر دیا ہر شئے سے مستغنی
حسد ہے بادشاہوں کو گدائے یار پر کیا کیا
رہا محروم میں بھی خوبیٔ مقسوم سے ورنہ
لُٹی دولت درِ دولت سرائے یار پر کیا کیا

مذکورہ بالا اشعار میں عشق مجازی اور عشق حقیقی کو کتنے دل کش پیرائے میں بیان کیا ہے اور ذرا اس غزل کے بھی چند اشعار ملاحظہ کیجئے، جس میں انسان کی حقیقت کو کس کیف و کم میں پیش کیا ہے ؎

واقفِ سرِ نہاں ہوں کیا کہوں — میں تو گونگے کی زباں ہوں کیا کہوں
واجب و ممکن میں ہے اک ربطِ خاص — رازدارِ کن فکاں ہوں کیا کہوں
درد کا مجھ میں اثر ہے کچھ سعید
میں سرابِ رفتگاں ہوں کیا کہوں [1]

---

[1] تذکرہ مسلم شعرائے بہار حصہ اول ص ۲۴۴

حضرت سید شاہ عطا حسین فانی گیاوی رح

حضرت سید شاہ عطا حسین المتخلص بہ فانی گیاوی، صوبہ بہار کے ایک مشہور صوفی خانوادہ، داناپور کے چشم و چراغ ہیں۔ آپ کا جدی و مادری نسب نامہ

حضرت عبداللہ بن امام محمد باقرؑ پر منتہی ہوتا ہے۔ آپ کی ولادت باسعادت ۱۲۳۲ھ میں داناپور میں ہوئی۔ علوم درسیہ کی تعلیم اپنے خاندان ہی میں ہوئی۔ تعلیم باطنی کی طرف دل متوجہ ہوا تو سب سے پہلے اپنے جد امجد حضرت سید شاہ غلام حسین داناپوریؒ کے دست حق پرست پر سلسلہ چشتیہ خضریہ منعمیہ میں بیعت ہوئے اور اجازت و خلافت سے بھی نوازے گئے۔ تعلیم روحانی کی تکمیل کا جب ذوق زیادہ ہوا تو اسی وقت آپ کے پیر کا وصال ہو گیا۔ اس لیے حضرت فانیؔ نے علوم باطنی کی تکمیل اپنے ماموں قطب العصر حضرت سید شاہ قمرالدین حسین عظیم آبادی سے کی۔ آپ انگریزی دور حکومت میں بسلسلۂ ملازمت غازی پور گئے۔ اور وہاں شہر کوتوال مقرر ہوئے۔ اسی دوران آپ کو اپنے مرشد حضرت شاہ قمرالدین حسینؒ کے وصال کی خبر ملی۔ یہ سن کر آپ اپنے عہدے سے مستعفی ہو کر عظیم آباد واپس آ گئے۔ آپ پاپیادہ ۱۲۶۰ھ میں حج کے لیے تشریف لے گئے۔ وہ سارے حالات آپ اپنے اردو سفر نامہ "ہدایت المسافرین" میں تحریر فرماتے ہیں۔ مدینہ منورہ کے قیام کے دوران عالم مثال میں آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کے دربار میں حاضری ہوئی وہاں سے آپ کو گیا (صوبہ بہار) جانے کا حکم ہوا[۱]۔ بحکم نبوی صلی اللہ علیہ وسلم۔ آپ ۱۲۶۵ھ میں گیا تشریف لائے اور مولوی سید اشرف حسین صدر الصدور، ساکن سورج گڈھ ضلع مونگیر کے مکان پر قیام کیا اور رشد و ہدایت کا سلسلہ وہیں سے جاری ہوا۔

حضرت فانیؔ کثیر التصانیف بزرگ گذرے ہیں۔ آپ کی تصنیفات و تالیفات میں کم و بیش ۳۵ رسالے ہیں۔ آپ کے دو اردو دیوان خانقاہ منعمیہ ابوالعلائیہ رام ساگر گیا میں محفوظ ہیں۔ راقم الحروف نے صرف ایک دیوان کی زیارت کی ہے۔ اردو میں تصوف کے نکات پر تین مثنویاں ہیں۔ ایک مثنوی

---

[۱] یہ تمام واقعات مثنوی سر عطا میں حضرت سید شاہ عطا حسین فانیؔ نے منظوم کیا ہے۔ یہ مثنوی قلمی ہے اور خانقاہ منعمیہ رام ساگر گیا میں محفوظ ہے۔

سرِ علا، دوسری مثنوی گنجینۂ اولیاء اور تیسری مثنوی سر حق (مطبوعہ)۔ مذکورہ دو مثنویاں ابھی تک مخطوطہ کی شکل میں خانقاہ منعمیہ کی زینت ہیں۔ آپ کا وصال ۷ اشوال ۱۳۱۱ھ میں گیا میں ہوا اور اپنی خانقاہ ہی میں مدفون ہوئے۔ آپ کا مزار مبارک آج بھی مرجع خلائق ہے۔

آپ کو شعر و شاعری سے فطری لگاؤ تھا۔ آپ نے فارسی کے صوفی شعراء کے اشعار کا بالاستیعاب مطالعہ کیا اور خاطر خواہ استفادہ کیا۔ فطری لگاؤ نے اس جذبے کو تیز کیا اور آپ کا کلام حقائق و معارف سے منور ہو گیا۔ حضرت فانی کے کلام میں صوفیانہ حقائق کی جلوہ گری ہے۔ ندرتِ خیال اور زبان و بیان کی بھی دل کشی ہے ملاحظہ ہو ؎

ذاکر کے تو ہے زعم میں مذکور نہاں میں
عارف تو اسے دیکھتے ہیں عین عیاں میں

مردانِ خدا جو ہیں وہ ہیں عارف باللہ
تفریق نہیں میں ہے کہ کچھ پیر و جواں میں

کعبہ میں اسے ڈھونڈے ہیں عابد و ساجد
سالک اسے سمجھے ہے کہ ہے کون مکاں میں

خواجہ میر درد کی مشہور غزل جس کا ایک مشہور شعر ہے ؎

تر دامنی پہ شیخ ہماری نہ جا ابھی
دامن نچوڑ دیں تو فرشتے وضو کریں

فانی کی بھی ایک غزل اسی انداز کی ہے۔ ملاحظہ کیجئے ؎

گر پاس تو نہ ہو تو تیری جستجو کریں — ہم دیکھتے رہیں تجھے جس سمت رو کریں
سجدہ ہو تیرے در پہ مرا اس گھڑی قبول — رو رو کے اپنے اشک سے جب ہم وضو کریں
شرمندہ ہوں گناہ سے اپنے میں اس قدر — کیا چشم پر گنہ کو تیری دو بدو کریں
بندہ قصور وار ہے خالق مرا غفور — اب خوف حشر دل میں بھلا ہم کبھو کریں

کار مجاز مجھ پہ ہوا اس قدر بلند　　خرقہ کو چاک کر کے کیا ہا و ہو کریں
فانی کو تو دکھائیو اپنا جمال پاک
جس دم بروز حشر ترے روبرو کریں

کھول آنکھ اپنی دیکھ عیاں حق کا نور ہے　　ہر برگ و ہر شجر میں اسی کا ظہور ہے
جس جا پہ نور حق کا ہوئے تم پہ جلوہ گر　　سمجھو میں اس زمیں کو وہی کوہ طور ہے
ساجد اوٹھا قدم نہیں جائے قیام ہے　　اپنا مقام جو ہے وہ منزل تو دور ہے
مخلوق تو ہوا ہے فقیری کے واسطے　　بے فائدہ ہوس تجھے مال و فور ہے
جتنا ملے جہاں میں قناعت اوسی پہ کر　　کر ترک حرص و آز گر اہلِ شعور ہے
فانی قریب موت ہے رہ یاد حق میں تو
یہ دم تو واپسیں ہے کل نفخ صور ہے

جب خودی احدیت نے دور کیا　　نور وحدت نے تب ظہور کیا
نار کو دیکھ گر پڑے موسیٰ　　عزم جس دم کہ کوہِ طور کیا
جب نظر آیا وہ مرے دل میں　　دل ناچیز نے غرور کیا
آئینہ دل کو صاف کر دیکھا　　اس میں اصلا نہیں قصور کیا
وہ جو آیا نظر نہیں دل میں　　شیشۂ دل کو میں نے چور کیا
سر باطن سے کب ہو وہ آگاہ　　جس نے جبہ پہن کے زور کیا
خوابِ غفلت سے جاگ اے فانی
حق نے اب حکم نفخ صور کیا

حضرت شاہ امین احمد شوقؔ بہاریؒ

آپ حضرت مخدوم جہاں شیخ شرف الدین یحییٰ منیریؒ کے اخلاف و اولاد میں سے ہیں یعنی حضرت سید شاہ امیر الدین وجدؔ کے صاحبزادے اور جانشیں ہیں۔ آپ کا اسم شریف امین احمد اور لقب جناب حضور ہے۔ آپ اپنے عہد کے صاحب علم و فضل بزرگ گذرے ہیں۔ آپ کی ولادت باسعادت ۱۲۴۸ھ میں خانقاہ بہار شریف میں ہوئی۔ ابتدائی تعلیم خاندان میں ہوتی رہی اور تکمیل تعلیم بہار شریف کے مشاہیر علماء سے ہوئی۔ تعلیم کے بعد مطالعہ کا شوق کافی رہا۔ کہا جاتا ہے کہ اسی میں آپ اپنی ظاہری بینائی سے محروم ہو گئے۔ لیکن بینائی باطن نے آپ کو مزید بصارت بخشی۔ تعلیم ظاہری کے بعد تعلیم روحانی میں مشغول ہوئے۔ خانقاہ شعیبیہ شیخ پورہ کے سجادہ نشیں اور پیر طریقت حضرت سید شاہ جمال علی بلخی کے دست حق پرست پر بیعت ہوئے۔ آپ کے پیرو مرشد نے آپ کو اجازت و خلافت سے نوازا اور تعلیم باطنی و روحانی کے لیے خانقاہ اسلام پور کے سجادہ نشیں، مرشد کامل، حضرت سید شاہ ولایت علی ہمدانی قادری ابوالعلائیؒ کی خدمت میں بھیجا اور ہدایت کی کہ جو کچھ تم کو فیوض و برکات ملیں گے وہ انہی کے خصوصی توجہ سے ملیں گے۔ آپ کافی لگن اور شغف کے ساتھ خدمت مرشد میں اکتساب فیض کرتے رہے۔ کبھی وہ خانقاہ اسلام پور مرشد کی خدمت میں جاتے اور کبھی آپ کے مرشد حضرت شاہ ولایت علی علیہ الرحمہ بہار شریف عرس میں شرکت کے لیے تشریف لے جاتے تو آپ کی صحبت و خدمت میں برابر حاضر رہتے۔ آپ کے مرشد کامل نے آپ کی شہرت و بزرگی کی بشارت دی تھی اور آپ کو اپنے تمام خاندانی سلاسل کی اجازت و خلافت سے سرفراز کیا۔ آپ کی شہرت و بزرگی کا فیضان دُور دُور تک پہنچا۔ ہندوستان کے مختلف صوبوں میں

آپ کے خلفا بھی رشد و ہدایت کے فرائض انجام دیتے رہے۔

آپ کو شعر و شاعری کا گہرا فطری ذوق تھا اگرچہ آپ نے کسی کے سامنے زانوئے تلمذ تہ نہیں کیا۔ خود ایک شعر میں فرماتے ہیں ؎

شعر گوئی میں نہ دیکھا منہ کسی استاد کا

آپ قادر الکلام شاعر تھے۔ فارسی میں ثبات اور اُردو میں ذوقؔ تخلص فرماتے تھے۔ مثنوی گوئی میں کمال حاصل تھا۔ فارسی میں آپ کی متعدد مثنویاں ہیں۔ خاص کر میر نجات اصفہانی کی بحر میں اسی روش کے مطابق آپ نے متعدد مثنویاں کہی ہیں جو حسب ذیل ہیں :

(۱) شجرات طیبات : اس میں مختلف بحروں میں شجرے منظوم کیے گئے ہیں اور ایک مناجات بھی شامل ہے۔

(۲) گل بہشتی : اس میں پیران چشت کے مختصر احوال منظوم ہیں۔

(۳) گل فردوس : اس میں اپنا نسب نامہ بھی منظوم کیا ہے۔

(۴) سلسلۃ اللآلی : یہ مختلف شجروں کا مجموعہ ہے۔

یہ سب مثنویاں فارسی میں ہیں اور میر نجات اصفہانی کی بحر میں ہیں۔

جناب حضور حضرت شوقؔ بہاریؒ نے اُردو شاعری میں اپنی قادر الکلامی کا ثبوت پیش کیا ہے۔ آپ کا مکمل دیوان ردیف وار مرتب ہے۔ اس میں غزلوں کے علاوہ تقریباً دو سو رباعیاں بھی ہیں۔ کلام میں حقائق و معارف کی تعلیم ہے۔ اور تغزل کا بھی گہرا رنگ ہے، عشق مجازی اور عشق حقیقی کی بھی جھلک نمایاں ہے۔ نمونہ کلام ملاحظہ ہو ؎

ہے شغل تصور جو تیرا دمبدم اپنا
سب کار سے بڑھ کر ہے یہی کار اہم اپنا

انساں کا معاصی سے ہے بچنا نہیں آساں
ہاں اس پہ خدا اگر کرے فضل و کرم اپنا

اور صوفیانہ خیالات کو عام فہم انداز میں ان اشعار میں دیکھئے ؎

اللہ ترا عام جو انعام ہو گیا جاری مری زباں پر ترا نام ہو گیا
کر اس کی جستجو وہ ملے گا تجھے ضرور کوشش جو تو نے کی تو ترا کام ہو گیا

حضرت موصوف کی اس غزل میں تصوف کی چاشنی بھی ہے اور تغزل کا رنگ و آہنگ بھی ؎

عیاں کس جگہ تیرا جلوہ نہیں ہے ولیکن مجھے چشم بینا نہیں ہے
نگاہِ تلطف کو ہرگز نہ کم کر ستم اس سے کوئی زیادہ نہیں ہے
جو چاہے ستم کر گوارا ہے مجھ کو مگر تیری فرقت گوارا نہیں ہے
ہے طاعت پہ مغرور نادان زاہد ترے سبحہ میں رام دانا نہیں ہے
رہِ منزلِ دل نہ کیوں کر ہو مشکل یہ پاؤں سے جانے کا رستہ نہیں ہے

تجھے بحرِ غم سے گذرنے کو اے شوق
ہماری غزل کا سفینہ نہیں ہے

حضرت سید شاہ فرزند علی صوفی منیری رح

حضرت فرزند علی صوفی منیریؒ اوصاف اور مشرب ظاہری اور باطنی دونوں حیثیتوں سے صوفی صافی تھے۔ گمنام پسندی ان کا مسلک اور عزلت گزینی ان کا مشرب اور یہ ہمت خاص اپنے بزرگوں سے ورثے میں پائی تھی۔ حضرت صوفی منیریؒ کا خاندان اپنے حسب و نسب اور دینی خدمات کی وجہ سے بالعموم ہندوستان میں اور بالخصوص صوبۂ بہار میں ممتاز رہا ہے۔ آپ کی چوبیسویں پشت میں گلشن رسالت کے ایک ممتاز پھول حضرت امام جعفر صادق رضؓ کے صاحبزادے حضرت امام محمد دیباجؒ کی ذات بابرکات نمایاں نظر آتی ہے۔ امام محمد دیباج کے متعلق متعدد تذکروں اور نسب ناموں میں

تحریر ہے کہ :

"آپ حضرت امام جعفر صادق رضؓ کے پانچویں صاحبزادے تھے۔ یہ خلیفہ منصور کے عہد خلافت میں زیادہ مشہور ہوئے۔ اولاد امام حسینؓ ہونے کے سبب مقبولیت اور عوام کی توجہ زیادہ ہوئی تو خلیفہ منصور کو اپنی خلافت سے اندیشہ ہوا، اس نے ملزم قرار دے کر آپ کو زندہ دیوار میں چنوا دیا تو آپ کے صاحبزادے حضرت سید جعفر نیشاپوریؒ مع اہل و عیال ملک خراسان چلے آئے۔ پھر یہ خاندان نیشاپور منتقل ہو کر متوطن ہو گیا۔"[1]

جب یہ خاندان نیشاپور منتقل ہوا تو پھر آپ کی اولاد میں سے حضرت سید السادات علیم الدین گیسو دراز دانش مند نیشاپوریؒ تقریباً ۶۷۰ھ میں یعنی حضرت مخدوم جہاں شیخ شرف الدین احمد یحییٰ منیریؒ کے عہد میں بہار شریف آئے اور حضرت مخدوم جہاںؒ سے مرید ہوئے اور اجازت و خلافت سے نوازے گئے۔ سید علیم الدین گیسو دراز دانش مند نیشاپوریؒ کے بڑے صاحبزادے حضرت سید محمد فردوسیؒ کی شادی حضرت مخدوم شاہ بدرالدین بدر عالم زاہدیؒ میرٹھی کی بیٹی ولیہ کاملہ حضرت بی بی ابدالؒ سے ہوئی۔ اسی نسبت سے آپ کی اولاد ابدالی کہی جاتی ہے۔[2]

حضرت سید علیم الدینؒ کے اخلاف و اولاد صوبہ بہار میں بود و باش اختیار کر کے رشد و ہدایت انجام دیتے رہے۔ حضرت صوفی منیریؒ کا ننہالی خاندان بھی اپنی عظمت و بزرگی کی وجہ سے ہندوستان اور خاص کر صوبہ بہار میں ممتاز رہا ہے۔ اس لیے کہ فاتح بہار حضرت امام محمد تاج فقیہؒ کے بڑے صاحبزادے حضرت اسرائیلؒ کی اولاد میں سے ہیں۔ حضرت اسرائیلؒ کے پوتے اور دنیائے تصوف کے درخشندہ ستارے حضرت مخدوم جہاں شیخ شرف الدین احمد یحییٰ منیریؒ ہیں۔ جن کی

---

[1] کنز الانساب مصنفہ کبیر الدین ص۴۳، ذریعہ دولت : مرتبہ ڈاکٹر طیب ابدالی ص۱۲۳

[2] حضرت صوفی منیریؒ کے نثری کارنامے ص۳۲ مصنفہ ڈاکٹر طیب ابدالی

بڑی صاحبزادی بی بی فاطمہؓ کی اولاد میں سے حضرت صوفی منیریؒ ہیں۔ غرض کہ حضرت صوفی منیریؒ کا دادھیال اور نانیہال، خاندانی حسب و نسب، بزرگی اور تقدس اور عظمت و شہرت کے اعتبار سے صوبہ بہار میں ممتاز رہا اور ہے۔

آپ کی ولادت باسعادت ۱۲۵۳ھ مطابق ۱۸۳۷ء میں اپنے نانیہال قصبہ منیر شریف ضلع پٹنہ میں ہوئی۔ مادہ تاریخ ولادت منظر حق ہے۔ آپ کے والد حضرت سید شاہ محمد علی ابدالیؒ کا سایہ ۱۲۶۰ھ میں سر سے اٹھ گیا۔ اس وقت آپ کی عمر صرف سات برس کی تھی۔ آپ کے ماموں حضرت شاہ اعظم علی عرف سکین منیریؒ نے آپ کو اور آپ کے بڑے بھائی، ایک بہن اور آپ کی والدہ ماجدہ کو مستقل طور پر منیر شریف منتقل فرما دیا تھا۔ آپ کی تعلیم و تربیت اپنے ماموں کے زیر سایہ ہوئی۔ آپ کی شادی صوبہ بہار کے مشہور صوفی خانوادہ اور خانقاہ اسلام پور کے سجادہ نشیں حضرت سید شاہ ولایت علی ہمدانیؒ کی صاحبزادی سے ہوئی۔ لہ

لہ آپ کے خسر حضرت شاہ ولایت علی ہمدانیؒ کی ولادت ۱۲۱۷ھ میں اور وفات ۱۳۰۰ھ میں ہوئی۔ آپ کے خسر شاہ ولایت علیؒ خانقاہ اسلام پور کے سجادہ نشیں تھے۔ نویں صدی میں دیوان شاہ حبیب اللہ قادریؒ اور سید اعظم علی ہمدانیؒ کی مسند سجادگی کا اسلام پور میں ثبوت ملتا ہے۔ آپ اپنے نانا حضرت ہدایت علی بلخیؒ کے مرید و مجاز اور سلسلہ ابوالعلائیہ کے مشہور بزرگ مخدوم شاہ یحییٰ علی نوآبادیؒ کے مجاز و خلیفہ تھے۔ "نفر مجوب" میں شاہ محمد اکبر ابوالعلائی داناپوری نے لکھا ہے کہ "حضرت شاہ ولایت علی قدس سرہٗ اپنے عصر کے یگانہ و بے مثل تھے۔" "تذکرۃ الابرار" مصنفہ محمد واجد میں تحریر ہے کہ مخدوم یحییٰ علیؒ کے خلفاء میں شاہ ولایت علی ممتاز تھے۔" "تذکرہ ابوالمجیب" میں ہے کہ "حضرت شاہ ولایت علی اسلام پوری قدس سرہٗ جو سلسلہ منعمیہ کے مشائخ اور صوبہ بہار میں تیرہویں صدی کے بزرگوں میں عارف کامل شیخ گذرے ہیں۔" انوار ولایت میں ان کی تفصیلی حالت ہے۔

شادی کے بعد فارسی و عربی کی کامل دستگاہ مولوی حسام الدین حیدر اور مولوی فیض اللہ پشاوری سے اسلام پور میں حاصل کی۔ آپ اپنے بڑے بھائی حضرت سید شاہ اولاد علیؒ کے دست حق پرست پر بیعت ہوئے اور اجازت و خلافت سے نوازے گئے۔ پھر حضرت نے اپنا جانشین بنایا۔ حضرت صوفی منیریؒ کو اپنے بزرگان سلاسل سے غایت عقیدت تھی۔ کتب بینی کا اس قدر شغف تھا کہ حضرت مخدوم جہاںؒ کی تمام تصانیف و تالیف کی طرف مائل ہو گئے۔ تصوف کی طرف آپ کا فطری میلان تھا۔ اس لیے آپ نے متعدد شعری و نثری تصانیف لکھی ہیں جس سے آپ کے سنجیدہ اور گہرے علمی مذاق، ادبی ذوق اور سلیقہ تحریر کا پتہ چلتا ہے۔ اُردو نثر میں آپ کی متعدد تصانیف خراج عقیدت حاصل کر چکی ہیں۔ جس کی تفصیل یہ ہے:

(۱) راحت روح —— ایک تمثیلی داستان ہے جس میں صوفیانہ خیالات کو پیش کیا گیا ہے۔ مقفیٰ اور مسجع عبارت میں ہے۔ غالب دہلوی کی خدمت میں پیش کرنے کے لیے لکھا تھا لیکن ان کا انتقال ہو گیا تھا اس کے بعد مکمل ہوئی۔ اس کو دوسری مرتبہ راقم الحروف نے ایڈٹ کر کے زیور طبع سے آراستہ کیا ہے۔

(۲) وسیلۂ شرف و ذریعۂ دولت —— بزرگان سلسلہ فردوسیہ کے حالات میں یہ پہلا تذکرہ ہے، جو اُردو زبان میں لکھا گیا۔

(۳) خط راست —— یہ تصنیف ایک خط کے جواب میں ہے جو عقائد پر لکھی گئی ہے۔ ابھی تک قلمی ہے۔

(۴) العروۃ الوثقیٰ —— یہ تصنیف ایمان و عقائد پر ہے مگر نامکمل رہ گئی اس لیے کہ مصنف کی زندگی نے وفا نہ کی۔ یہ بھی میرے کتب خانہ کی زینت ہے۔

حضرت صوفی منیریؒ کو اللہ تعالےٰ نے فکری ذوق اور شاعرانہ مزاج ودیعت کیا تھا اور پھر آپ کا ماحول بھی شاعرانہ تھا۔ آپ کے خالہ زاد بھائی جوشش منیری بھی شاعر تھے اور وہ عبد الغفور نساخ سے مشورۂ سخن کرتے۔ ان کی خواہش تھی کہ آپ بھی

انساخ سے اصلاح سخن لیتے۔ آپ نے اسے قبول نہ کیا۔ اس لیے کہ آپ کو ایک ایسے استاذ فن کی تلاش تھی جو یگانۂ روزگار ہو اور اس فن میں ایسی دستگاہ رکھتا ہو جو دوسروں کے لیے نارسا ہو۔ اس عہد میں غالب کی شخصیت شعراء کی صف میں لعل شب چراغ کی تھی اور چونکہ صوفی منیریؒ بھی انفرادیت پسند تھے اور مخدوم جہاںؒ کے پیر حضرت نجیب الدین فردوسیؒ سے سلسلہ بیعت کی وجہ سے روحانی وابستگی بھی دہلی کو ماویٰ و ملجا سمجھتے تھے۔ اسی لیے آپ نے اصلاحی مسودہ غالب دہلوی کی خدمت میں بذریعہ ڈاک دہلی روانہ کیا۔ غالب نے آپ کے کلام پر اصلاح شروع کرنے سے پہلے الامر فوق الادب لکھ کر اپنے حسن ادب کا اظہار کیا اور بعض اشعار پر دو دو صاد بنائے اور جواب میں حضرت صوفی منیریؒ کو پیرومرشد سے خطاب کرکے خط لکھا۔ غالب نے جن اشعار پر صاد بنایا ہے ان میں سے چند اشعار پیش کیے جاتے ہیں تاکہ صوفی منیریؒ کے کلام کی عظمت واضح ہو۔ اس شعر پر غالب نے دو دو صاد بنائے ہیں؎

نورِ حق جلوۂ رب شانِ الٰہ　　ہے نو بندہ مگر اللہ اللہ　　ص ص غالب

حسرتِ دید بس نکل جائے　　دل سے دل کی ہوس نکل جائے　　ص　　"

جی دیا ہم نے مدعا نہ ملا　　خوں بہا اور خوں بہا نہ ملا　　ص　　"

دل کو چاکِ جگر سے راہ ہوئی　　بے قراری قرارگاہ ہوئی　　ص　　"

غم دیں تھا نہ فکرِ دنیا تھی　　محویت جی میں کارفرما تھی　　ص　　"

کاش ہو دل میں عاشقی کا گھر　　سب کے جی میں ہو کاش اس کا گذر　　ص　　"

مذکورہ بالا مثنوی کے اشعار پیش کرنے کی غرض و غایت یہ ہے کہ اس سے صوفی منیریؒ کی قادر الکلامی اور غالب کی پسندیدگی پر روشنی پڑسکے۔

صوفی منیریؒ عملی طور پر صوفی تھے اور مسند سجادگی پر متمکن۔ اس لیے صوفیانہ خیالات کو آپ نے تجربے کی روشنی میں پیش کیا ہے۔ ان کے اشعار ان کے واردات قلبی اور مشاہدات کے آئینہ دار ہیں۔ یہ دو اشعار ملاحظہ ہوں ؎

لاکھوں دنیا میں ہے زہد اور عبادت والے
کہیں دو چار ہی نکلیں گے محبت والے

باتیں اچھی ہیں برائی ہے تو بس اتنی ہے
نیک اپنے کو سمجھتے ہیں نصیحت والے

شراب حقیقت کا بھی انداز نرالا ہے اور عشق کا بھی انداز انوکھا ہے۔ صوفی منیریؒ کے دو اشعار ملاحظہ کیجئے ؎

قدم بوسی تری کرتا زمینِ آستاں ہو کر
خجل ہے آسماں قسمت سے اپنی آسماں ہو کر

امنگ کر رہ گئے زہاد ہم مے پی کے چل نکلے
گئی ہے راہ کوئے یار کی باغِ جناں ہو کر

صوفی منیریؒ کی غزل کے چند اشعار ہیں جن میں صوفیانہ خیالات کو دل کش پیرائے میں پیش کیا ہے ؎

دل کو دی ہے خبر حشر محبت مجھ کو
وصلِ جنّت ہے جہنّم تری فرقت مجھ کو

ہے ثواب اس میں وفا اور ہے اعراض گناہ
شرک اس راہ میں ہے غیر کی الفت مجھ کو

تیرے قدموں سے ہوا مجھ کو قیامت کا یقیں
پھر دکھا بہر خدا جلوۂ قامت مجھ کو

کر دے آباد مرے گھر کو اب اے جلوۂ حسن
کر دیا ہے سیہ عشق نے غارت مجھ کو

دل افسردہ خیالوں سے بہل جاتا ہے
کم نہیں بت کدہ سے گوشۂ عزلت مجھ کو

دار فانی کی کوئی چیز نہیں لینے کی
لینی ہوتی تو پسند آنی تھی غربت مجھ کو

صوفی منیریؒ کے اشعار میں کیف و کم بھی ہے اور عشق کی سرمستی بھی۔ ان کے اشعار تصوف کی کیفیت میں ڈوبے ہوئے ہیں۔ لیکن غزل کی ہم آہنگی بھی ہے۔ حضرت صوفی منیریؒ کی غزل کے چند اشعار پیش خدمت ہیں جس میں تصوف کی مختلف کیفیات کی رنگا رنگی ہے۔

حاصل ہے میرے اشک کا حرماں کہیں جسے
سایہ ہے وہ مرا شبِ ہجراں کہیں جسے

اے رشک مہر جلوہ ترا ہے نگاہ سوز
پردہ ترا ہے عارضِ تاباں کہیں جسے

مجھ کو کہ مدتوں پہ قفس سے رہا ہوا
صبحِ وطن ہے شامِ غریباں کہیں جسے

خوگر ہوں مشکلوں کا امیدِ وصال میں
دشوار مجھ پہ ہے وہی آساں کہیں جسے

خوش ہوں جنوں سے میں کہ وہ کرتے ہیں التفات
ہے صبحِ عید چاکِ گریباں کہیں جسے

سعی طلب میں سرمہ کروں چشمِ شوق کا
وہ اک کفِ غبارِ بیاباں کہیں جسے

جلوہ کو تیرے حشر کا کیوں انتظار ہے
جلوہ ترا ہے حشر کا ساماں کہیں جسے

کر غرق بحرِ عشق کہ کافی نہیں مجھے
حمام گرم دوزخِ سوزاں کہیں جسے

وہ غم سرشت ہوں کہ ہے عشرت کدہ مرا
اس سے پرے کہ روضۂ رضواں کہیں جسے

صوفی بتائے منزلِ جاناں کی راہ کون
اب چپ ہے وہ جرس دلِ نالاں کہیں جسے

صوفی منیریؒ نے صوفیانہ خیالات کو کبھی اصطلاحی رنگ میں پیش کیا ہے اور کبھی فلسفیانہ انداز میں۔ لیکن ہر جگہ صوفی کا اپنا رنگ نمایاں ہے۔ اس غزل میں صوفی کو اسی رنگ میں دیکھئے

ہستی میں دو خدا ہوں یہ باطل خیال ہے
دو روحیں ایک جسم میں ہوں یہ محال ہے

اللہ ایک ہے نہیں اس کا کوئی شریک
قالب میں روح وحدتِ حق کی مثال ہے

ہے تن میں حکمراں پہ نظر سے نہاں ہے روح
حسن اور جسم کی حرکت اس پہ دال ہے

جیسا کہ جسم مظہر آثار روح ہے
روحِ لطیف جلوہ گہ ذوالجلال ہے

افعال ہیں گواہ ثبوت صفات کے
صوفی دلیل ذات صفاتِ کمال ہے

صوفی منیریؒ چونکہ صوفیانہ خیالات کی وجہ سے علمی اور عملی طور پر صوبہ بہار میں بالخصوص ممتاز ہیں اس لیے مزید ایک غزل کا اضافہ کرتا ہوں تاکہ ان کی شخصیت نمایاں ہو سکے :

بیخودی کو دردِ دل کی ہوں دوا سمجھے ہوئے
مانگتا ہوں میں خدا حق سے شفا سمجھے ہوئے

رنج کے خوگر ہیں وہ ان کو بلا میں عیش ہے
جو کہ دنیا کو ہیں دارِ ابتلا سمجھے ہوئے

صحبتِ پیرِ مغاں میں شب کھلا مجھ پر یہ راز
ہیں وہ اچھے جو ہیں اپنے کو برا سمجھے ہوئے

دل میں اس کو ڈھونڈتے ہیں کر کے ہم قطعِ نظر
نیستی کو رہ کشش کو یہ نما سمجھے ہوئے

حضرت صوفی منیریؒ کا وصال ۶ ذی قعدہ ۱۳۱۵ھ میں خانقاہ اسلام پور میں ہوا۔ اور وہیں سپردِ خاک کیے گئے۔ آپ کا مزار مرجع خلائق ہے۔ آپ کی مسند سجادگی پر آپ کے چھوٹے صاحبزادے حضرت سید علی علیہ الرحمہ جلوہ افروز ہوئے جو حضرت سید شاہ ایوب ابدالی نیر اسلام پوریؒ کے والد و مرشد ہیں۔

صوفی منیریؒ کے کچھ ایسے اشعار بھی ہیں جو صوفیانہ خیالات کو تو پیش کرتے ہی ہیں لیکن زبان کی لذت و چاشنی کا بھی لطف دیتے ہیں ؎

مسجد گیا تھا صبح مناجاتیوں کے ساتھ
پر اس لیے کہ وصل دل آرام چاہیے

کل ہم کریں گے عرض کہ رحمت کی نذر کو
ہدیہ گناہ لائے ہیں انعام چاہیے

اور اس شعر کے خیال کو تصوف کی برگزیدہ ہستیوں نے بھی پیش کیا ہے ؎

غرض اپنی اپنی ہے راہزن غم عشق پاس و وفا کسے
کہ کسی کو خوفِ عذاب ہے کوئی ہے خیالِ ثواب میں

حضرت شاہ محمد اکبر داناپوریؒ

حضرت امام تاج فقیہہ کی اولاد اپنی عظمت و بزرگی کی وجہ سے صوبہ بہار کی ہر قدیم خانقاہ سے نسبت رکھتی ہے۔ حضرت شاہ اکبر داناپوری بھی حضرت امام تاج فقیہہ کے چھوٹے صاجزادے حضرت عبدالعزیز کی اولادمیں سے ہیں۔ آپ حضرت سید شاہ محمد سجاد ابن سید شاہ تراب الحق موڑوی ابن قطب وقت حضرت طیب اللہ نقاب پوشؒ (موڑہ تالاب متصل بہار شریف) کے صاجزادے تھے۔ آپ کی ولادت باسعادت ۱۲۶۰ھ مطابق ۱۸۴۲ء کو شہر آگرہ کے محلہ نئی بستی میں ہوئی۔ اس وقت آپکے حقیقی چچا سید شاہ محمد قاسم داناپوریؒ عدالت عالیہ آگرہ میں ایک خدمت پر مامور تھے۔ آپ کی والدہ آپ کو لے کر حضرت سیدنا امیرابوالعلا رحمۃ اللہ علیہ کے مزار مبارک پر حاضر ہوئیں اور ان کے دین و دنیا کی ترقی اور کامیابی کے لیے دعا گو رہیں۔ بچپن ہی سے صوفیانہ مزاج تھا اور بزرگان دین سے کافی شغف اور لگاؤ تھا۔ آپ اپنے چچا حضرت شاہ محمد قاسم داناپوریؒ کے دست حق پرست پر سلسلہ ابوالعلائیہ میں بیعت ہوئے۔ ۱۲۸۱ھ میں آپ کو اجازت و خلافت سے بھی سرفراز کیا گیا۔ آپ چونکہ صوبہ بہار کے مشہور صوفی خانوادہ کے چشم و چراغ تھے۔ اس لیے تصوف سے فطری لگاؤ تھا۔ آپ کے خاندان کے اکثر و بیشتر افراد بھی شاعر تھے۔ اس لیے بچپن ہی سے آپ کو صوفیانہ شاعری کا ماحول ملا۔ آپ آتش کے شاگرد رشید وحید الہ آبادی سے اصلاح سخن لیتے رہے اور اس میں کمال حاصل کیا۔ اکبر الہ آبادی بھی وحید الہ آبادی کے شاگرد تھے۔ استاد کو ان دونوں شاگردوں پر فخر تھا۔ حضرت اکبر داناپوری عملی طور پر صوفی، باصفا تھے۔ اس لیے آپ کی شاعری میں بھی تصوف کی نمایاں جھلک نظر آتی ہے۔ ڈاکٹر کلیم احمد عاجز اپنے تحقیقی مقالہ میں اس طرح

رقم طراز ہیں :-

"اکبر داناپوری صرف صوفی شاعر ہی نہیں صوفی مسلک ہی نہیں ظاہر و باطن ان کا اسی رنگ میں رنگا ہوا ہے۔ اپنے دور کے صاحب حال بزرگوں میں سے تھے۔ ان کے عقیدت مندوں کا حلقہ صوبہ بہار سے مغرب میں صوبۂ متحدہ اور مشرق میں بنگال کے اکثر اضلاع میں پھیلا ہوا تھا حضرت وحید، آتش کے تلامذہ میں، آتش کے رنگ کو نمایاں کرنے میں سب سے زیادہ کامیاب ہوئے۔ اکبر کے مزاج میں وہی عناصر تھے جو فقر و توکل قلندریت، استغنا کو تقویت بخشتے ہیں۔ مزید برآں اکبر عشق و معشوق حقیقی کی مستی اور سرشاری سے بھی نوازے گئے تھے۔ اس لیے جناب اکبر کے یہاں یہ دو آتشہ رنگ ہے۔" لہ

شاہ اکبر داناپوری صوفی شاعر تھے۔ ان کی شاعری میں حقائق و معارف کا گہرا امتزاج ہے۔ اسی کی روشنی میں آپ کے کلام کا جائزہ لیا جاتا ہے۔ وحدت الوجود اور وحدت الشہود کے مسلک علم تصوف کے بڑے اہم مسائل ہیں۔ آپ نے اس پر بھی طبع آزمائی کی ہے۔ چند اشعار ملاحظہ ہوں ؎

وہ خود ہیں عین اشیاء اور اشیاء عین ہیں اس کی
اٹھا پردہ عین کا تو وحدت کیا ہے کثرت کیا

آفتاب ذات کے آگے صفت کا کیا وجود
سامنے خورشید کے جگنو کبھی چمکا نہیں

ہم ہیں کچھ اور ہی تھی اپنی حقیقت کچھ اور
خاک کیا نور کسے کہتے ہیں جوہر کیسا

کونسا ذرہ ہے کہ پنہاں نہیں جس میں خورشید
ہم کو ہر قطرہ سمندر ہے، سمندر کیسا

لہ تحقیقی مقالہ (مخطوطہ) از ڈاکٹر کلیم احمد عاجز ص ۲۱۲-۲۱۳

اس بیان کو تغزل کی آمیزش نے اور بھی دل کش اور دل چسپ بنا دیا ہے ؎

دیکھیں خوش ہو کے نہ کیوں آپ تماشا اپنا
آئینہ اپنا ہے، عکس اپنا ہے، جلوہ اپنا

مظاہر خداوندی ہر جگہ ہے، پردے میں بھی اور پردے سے باہر بھی۔ اسی کو الظاہر وھوالباطن کہتے ہیں۔ اس خیال کو اس طرح پیش کیا ہے ؎

تو ہے پوشیدہ ہر اک پردے میں اور صاف عیاں بھی
جلوہ آتا ہے نظر، ظاہر و پنہاں تیرا

رضئ مولیٰ از ہمہ اولیٰ پر اس طرح کاربند ہیں ؎

اکبر رضائے دوست کا اُمیدوار ہوں
خواہاں نہ خلد کا ہوں نہ طالب نعیم کا

اور یہ دو اشعار بھی تصوف کے اہم نکات کی نشان دہی کرتے ہیں جو قابل توجہ ہیں ؎

کی نظر اپنی حقیقت پر تو ظاہر یہ ہوا
یہ وہی قطرہ ہے اک روز جو دریا ہوگا

نقش اگر ہے تو ہے نقاش کا ہونا بھی ضرور
انجمن ہے تو کوئی انجمن آرا ہوگا

آپ کی ایک عارفانہ غزل کے چند اشعار بھی ہدیۂ قارئین ہیں۔ ملاحظہ ہو ؎

ہم تری راہ میں مٹ جائیں گے سوچا ہے یہی
دردمندانِ محبت کا طریقہ ہے یہی

آپ ہوں پیش نظر روح جو تن سے نکلے
اے مری جان مری آنکھوں کی تمنا ہے یہی

کوچۂ یار میں کھو جانے کو ہم آئے ہیں
راستہ مرحلۂ عشق کا سیدھا ہے یہی

بحرِ ذخارِ محبت کی نہیں ملتی تھاہ
جس میں ہم ڈوبنے والے ہیں وہ دریا ہے یہی

غور سے قطرے کی جانب جو نظر کی تو کھلا
ہم اسے قطرہ غلط سمجھے تھے دریا ہے یہی

دل میں اللہ کا گھر، آنکھوں میں حضرت کی جگہ
میرا کعبہ ہے یہی میرا مدینہ ہے یہی

ہے توکل مجھے اللہ پر اپنے اکبر
جس کو کہتے ہیں بھروسا وہ بھروسا ہے یہی

آپ کا وصال ۱۳۲۷ھ میں داناپور میں ہوا اور آپ کا مزار مبارک مرجع خاص و عام ہے۔

شاد عظیم آبادی

غزل گو شعرا میں شاد عظیم آبادی کا نام عظمت سے لیا جاتا ہے بالخصوص دبستان عظیم آباد کے شعرا میں ان کا شمار عظیم شعرا میں ہوتا ہے۔ آپ کا نام سید علی محمد اور شاد تخلص ہے۔ خان بہادر کے خطاب سے بھی نوازے گئے ہیں۔ آپ کے والد جد کا نام سید اظہار حسین عرف سید عباس مرزا ہے۔ شاد کے والد کی پیدائش الہ آباد میں ہوئی جہاں شاد کے دادا ایسٹ انڈیا کمپنی کی طرف سے تحصیل دار تھے۔ عظیم آباد میں مستقل سکونت شاد کے دادا نے اختیار کی۔ شاد کی والدہ مولانا حالی پانی پتی کے خاندان سے تعلق رکھتی تھیں جیسا کہ "تذکرہ مسلم شعرائے بہار" میں تحریر ہے۔ شاد کی پیدائش ۱۲۶۲ھ مطابق ۱۸۴۶ء کو شہر عظیم آباد محلہ پورب دروازہ اپنی نانیہال میں ہوئی۔ پانچ برس کی عمر تک نانیہال میں رہنے کے بعد دادھیال میں تعلیم پانے لگے۔ شاد نے اپنی تصنیف "نوائے وطن" میں جا بجا بہائیوں کو مخرب بیان اور ملزم قرار دیا تو اختلاف کا ایک زبردست طوفان اٹھ کھڑا ہوا اور خاص اس مقصد کے تحت اپنچ نامی ایک اخبار کی بنا ڈالی گئی جس میں شاد اور ان کی تحریروں کو نشانۂ تنقید بنایا جاتا تھا۔ ان کے کلام پر اصلاح بھی دی جاتی تھی۔ اس علمی اور ادبی اختلاف نے اتنا زور باندھا کہ آخر کار شاد یہ کہہ اٹھے کہ؎

خدا بھلا کرے اے شاد نکتہ چینوں کا
بتا دیا مجھے بچ بچ کے راستہ چلنا

اس مخالفت کا سلسلہ ختم نہ ہوا تو ترکِ وطن پر مجبور ہوئے۔ اپنے شعر میں وہ خود فرماتے ہیں ؎

ملے کچھ چین شاید شادؔ دل کو دشتِ غربت میں
ارادہ ہے کہ چندے دیکھ لوں ترکِ وطن کر کے

مگر شادؔ اپنی بعض مجبوریوں کے باعث ترکِ وطن نہ کر سکے۔ "تذکرہ مسلم شعرائے بہار" میں اس طرح تحریر فرماتے ہیں :۔

"اس میں شک نہیں کہ علامہ شادؔ نے اپنی حینِ حیات میں بھی بیرون سرزمین بہار اپنے متعلق قدردانیوں کے علمی مظاہرے دیکھے۔ ستائش کے میٹھے بول سُنے۔ لیکن صوبہ بہار میں حسبِ ظن علامہ شادؔ ان کی توقیر نہ کی گئی اور علمی و ادبی خدمات کے صلے میں ان میں مخالفت کی گئی۔ لیکن یہ راقم علامہ شادؔ مرحوم و مغفور کی سوء ظنی کا ہم نوا نہیں ہے۔ اگر صوبہ بہار میں رام پور اور حیدر آباد دکن کی طرح بھی اسلامی ریاست رہتی تو علامہ شادؔ کے گلے میں سچے موتیوں کے ہار ڈالے جاتے۔ اور ان کی ادبی و شعری خدمات کے صلہ میں ان کے اوپر سیم و زر نچھاور کیے جاتے لیکن انقلاب زمانہ کو کیا کہئے کہ غلامی کی روح فرسا زد سب سے پہلے بنگال اور بہار پر پڑی۔ بہار کے مسلمان اب تک اس قدر سوگ اور رنج و محن میں مبتلا تھے کہ ہر ایک کو اپنے جان و مال اور عزت و ناموس کے تحفظ کی فکر تھی ایسی حالت میں وہ کسی اہلِ علم اور اہلِ فکر و سخن کی کیا مدد کر سکتے تھے۔ تاہم اہلِ بہار نے علامہ شادؔ کو اس قدر نوازا ہے کہ بہار کے دل کے دل افراد نے اپنا دل، اپنا جگر اور اپنا دماغ علامہ شادؔ کے قدموں پر رکھ دیا۔" [1]

علامہ شادؔ کا ذوقِ شعری فطری تھا۔ آپ شاہ الفت حسین فریادؔ سے مشورہ

---

[1] تذکرہ مسلم شعرائے بہار حصہ دوم ص ۲۰۳

سخن کرتے تھے۔ آپ ایک قادر الکلام اور پُرگو شاعر تھے۔ آپ نے جملہ اصناف سخن پر طبع آزمائی کی۔ کلام شاد کے سلسلے میں مجموعۂ غزلیات "میخانۂ الہام" کے نام سے طبع ہو چکا ہے۔ مجموعہ مراثی ۲ جلدوں میں، مجموعہ رباعیات مع ترجمہ انگریزی اور مثنوی مادر ہند خراج عقیدت حاصل کر چکی ہیں۔ نثری تصانیف بھی متعدد ہیں جن میں نوائے وطن اور نقش پائدار کی شہرت ہے۔

شاد اپنے معاصرین میں بڑی شہرت کے مالک ہوئے اور صنف غزل گوئی میں اپنا ایک خاص مقام بنایا لیکن آپ کی غزلوں میں صرف تغزل ہی کا رنگ نہیں ہے بلکہ صوفیانہ آہنگ بھی ہے بلکہ علمی اور فنی طور پر وہ صوفی شاعر کی حیثیت سے کامیاب نظر آتے ہیں لیکن ان کا یہ رنگ زیادہ غالب نہیں ہے، البتہ متصوفانہ شاعری میں بھی انہوں نے اپنا زور قلم دکھلایا ہے اور صوفی شعراء میں ان کا شمار کیا جاسکتا ہے، ان کے چند اشعار ملاحظہ کیجئے جن میں تصوف کا رنگ و آہنگ دونوں ہی ہے ؎

اے ازلی الوجود اے ابدی البقا
بے ادبانہ نہ چل حلقۂ عبدیت میں آ

خالق و مخلوق تو مالک و مملوک تو
ساجد و مسجود تو عجب نہ کر سر جھکا

جان صداقت پہ ہے صدقے ہے فطرت تری
زیست کی پروا نہ کر زیست ہے دام فنا

گلشن حق الیقیں سامنے آنکھوں کے ہے
چہرہ سے اپنے ہٹا پردۂ بیم و رجا

روز ازل خود کہا جوش طرب میں الست
ہو گیا پھر کیوں خموش دے کے صدا کم بلا

تیری حقیقت تلک کس کی رسائی ہوئی
بازیٔ طفلانہ ہے مسئلہ ارتقا

جلوہ کناں تو جہاں واں نہیں دخل گماں
نقش تو تحت الثریٰ شان تو فوق السماء

اور شاد کی اس غزل میں آہنگ تصوف بھی ہے اور رنگ تغزل بھی، ملاحظہ کیجئے ؎

غور سے جب دل کو دیکھا اور تھا
ہر نظر میں اس کا نقشہ اور تھا

کھینچ لایا اور جانب ہم کو دل
ورنہ وحشت کا تقاضا اور تھا

ذکر کیا پیر مغاں کی بزم کا
واں کا ساغر اور مینا اور تھا

نت نئی تھی شان تیرے حسن کی
جب اٹھائی آنکھ نقشا اور تھا

شاد عظیم آبادی کی غزلوں میں حسن و عشق کی دل کشی ہے لیکن جذبات و احساسات کی شدت اور اخلاق و تصوف کی فلسفہ طرازی۔ انہیں صوفیانہ ایمائیت پر مجبور کرتی ہے، ملاحظہ ہو ؎

کمالِ حسن کو قدرت نے دل نواز کیا
یہ وہ عطا تھی کہ خود حسن نے بھی ناز کیا

ہزار شکر کہ میری نیاز مندی نے
نگاہِ ناز کو تیری گدا نواز کیا

ہجوم عام میں راحت کہاں نصیب ہے قبر
جگہ ملی تو ذرا پاؤں کو دراز کیا

زباں پہ آہ جو آئی تو ہنس کے ٹال دیا
کسی کے عشق کا افشا نہ میں نے راز کیا

شاد عظیم آبادی کی غزلوں میں حقائق و معارف کے نکتے بھی ملتے ہیں، اور کہیں زندگی کی حقیقت کی تلاش ہے جو انہیں عالم حیرت میں پہنچاتی ہے۔ اس غزل کے چند اشعار ملاحظہ کیجئے ؎

اسیرِ جسم ہوں میعادِ قید لا معلوم
یہ کس گناہ کی پاداش ہے خدا معلوم

سفر ضرور ہے اور عذر کی مجال نہیں
مزا تو یہ کہ نہ منزل نہ راستہ معلوم

سنی حکایتِ ہستی تو درمیاں سے سنی
نہ ابتدا کی خبر ہے نہ انتہا معلوم

طلب کریں بھی تو کیا شئے طلب کریں اے شاد
ہمیں تو آپ نہیں اپنا مدعا معلوم

صوبہ بہار کا یہ عظیم شاعر ۱۳۴۵ھ مطابق ۱۹۲۷ء کو اس دار فانی سے کوچ کر گیا اور پٹنہ سیٹی میں شاد منزل حاجی گنج میں آپ کی آخری آرام گاہ بنی۔

احقرؔ بہاری

صوبۂ بہار کے عظیم شعرا کی فہرست میں احقرؔ بہاری کا نام عظمت کے ساتھ لیا جاتا ہے۔ آپ کا اسم شریف بشارت حسین اور تخلص احقرؔ ہے۔ آپ اصل میں ملاڑہ کے متصل ایک شرفاء کی بستی بڑاڑی تھی، وہاں کے رہنے والے تھے۔ آپ کے والد ماجد کا نام شیخ اکبر حسین تھا جو اسی گاؤں کے رئیس تھے۔ آپ کی ولادت باسعادت ۱۲۷۶ھ مطابق ۱۸۵۹ء میں گاؤں ہی میں ہوئی۔ ابتدائی تعلیم کے بعد وہ بہار شریف اعلیٰ تعلیم کے لیے آئے اور پھر وہاں سے پٹنہ میں عربی و فارسی کی اعلیٰ تعلیم کے لیے بھیجے گئے۔ لیکن کچھ ہی دنوں کے بعد وہ پھر بہار شریف ہی میں آکر یہاں کے علمائے کرام سے تکمیل تعلیم کرتے رہے۔ شاعری کا شوق بچپن ہی سے تھا۔ چنانچہ جب دبستانِ لکھنؤ کی شہرت زیادہ ہوئی اور آتشؔ اور ناسخؔ کے شاگردوں کی شہرت زیادہ ہونے لگی تو وہ اپنے فن کی آبیاری کے لیے ۱۳۰۳ھ میں لکھنؤ تشریف لے گئے اور وہاں کے ادبی سرگرمیوں میں حصہ لینے لگے۔ آتشؔ کے شاگرد صباؔ کا زیادہ زور تھا اور ان کے شاگردوں کا حلقہ وسیع تھا۔ چنانچہ صباؔ کے شاگرد رشید ازلؔ لکھنوی سے اصلاح سخن لینے لگے اور اس پر ان کو فخر تھا۔ چنانچہ ایک شعر میں اپنے خیال کا اظہار اس طرح کرتے ہیں ؎

سب جانتے ہیں احقرؔ شاگرد ہوں ازلؔ کا
استاد مانتے ہیں اُردو زبان والے

احقرؔ کو آتشؔ سے اتنی عقیدت تھی کہ ان کے زبان و بیان اور ان کے قواعد کی سختی سے پابندی کرتے اور وہ خود کہتے ہیں ؎

آورد میں لذت خاک نہیں، آمد میں مزا ہے اے احقر
وہ چال نہ چل جو لوگ کہیں آتش کے چلن کو چھوڑ دیا

احقر بہاری دکن بھی تشریف لے گئے تھے اور نواب کے دربار میں رسائی بھی ہوئی مصنف "تذکرہ مسلم شعرائے بہار" لکھتے ہیں:

"احقر مرحوم ایک دفعہ حیدر آباد دکن بھی گئے۔ وہاں دربار میں ان کو باریابی ہوئی اور قدردانانِ سخن کی نظروں میں وہ کافی قدر و منزلت کی نگاہ سے دیکھے گئے۔ ریاست میں اچھی جگہ بھی دی گئی، لیکن کسی وجہ سے ناپسند کیا اور وہاں سے چلے آئے۔ تاہم ان کو دکن کی یاد آتی ہی رہی وہ کہتے ہیں ؎

رقت سے آپ کی ہمیں غربت وطن میں ہے
یاں کالبد ہے روح ہماری دکن میں ہے" ؎

حیدر آباد دکن سے واپسی کے بعد وہ کانپور میں رہنے لگے۔ ان کے قیام ہی کے زمانے میں مسجد کانپور کے شہید ہونے کا ہنگامہ برپا ہوا۔ اس ہنگامے میں کتنے باحمیت مسلمانوں نے جام شہادت نوش کیا۔ احقر بھی اس سے متاثر ہوئے اور حکومت کے بے جا تشدد کے خلاف ستر بند کا ایک مسدس لکھا جسے عام جلسوں میں بھی سنایا۔ مسدس کو حکومت نے ضبط کر لیا اور بغاوت کے الزام میں انہیں گرفتار کر لیا۔ پھر وہ بہار شریف چلے آئے۔ یہاں ان کو ایک حادثۂ عظیم پیش آیا یعنی ان کے نوجوان صاحبزادے داغ مفارقت دے گئے۔ وہ خود اس کا اظہار کرتے ہیں ؎

غضب اس سن میں ہے نورِ نظر کا دور ہو جانا
بڑا اندھیر ہے دن کا شب دیجور ہو جانا

لہ تذکرہ مسلم شعرائے بہار جلد اول صہ ۱۹

دیا پیرِ فلک نے داغ فرزندِ جواں احقر
نہ سوجھا دیدۂ یعقوب کا بے نور ہو جانا

احقر کی زبان میں لطفِ زبان بھی ہے اور رنگینیٔ بیان بھی بلکہ درد کی داستان ہے۔ وہ خود اپنے ایک شعر میں اس طرح کہتے ہیں ؎

اے اہلِ سخن ان شعروں میں تاثیر ہوئی ہے کب پیدا
جب درد کو دل میں رکھا ہے، آغوش میں غم کو پالا ہے

احقر بہاری کی غزلوں میں نہ صرف زبان کی چاشنی، محاورے اور روزمرہ کی رنگینی ہے بلکہ ان کے کلام میں کیف و سرمستی کی بھی ہماہمی ہے۔ ایک غزل کے چند اشعار ملاحظہ ہوں:

کھنچی ہے شمشیر ناز قاتل چلے ہیں مشتاق مرگ گھر سے
کفن لپیٹے ہوئے کمر سے کوئی اِدھر سے کوئی اُدھر سے

وہ گل بدن جان ہے چمن کی یہ جانتا ہوں میں پیشتر سے
ہنسا تو کلیاں چٹک کے نکلیں کیا تکلّم تو پھول برسے

دکھائیے آج روئے زیبا اٹھائیے درمیاں سے پردہ
کہاں سے اب انتظار فردا یہی تو سنتے ہیں عمر بھر سے

جفائے معشوق کا گلہ کیا صعوبتِ دشت کربلا کیا
قدم بھی ہٹتے ہیں عاشقوں کے اگر برستی ہے آگ برسے

دکھاؤں اشکوں کی گرم روانی، گھٹا ہو غیرت سے پانی پانی
ابھی کھلے حال لن ترانی ہٹاؤں دامن جو چشم تر سے

نہ بے قراری کا ڈھنگ آیا نہ اشک پرخوں کا رنگ آیا
چمک کے بجلی ہزار تڑپی، گرج کے بادل ہزار برسے

ادھر سے چلمن اٹھا کے جھانکا ادھر سے پردا اٹھا کے دیکھا
لگایا ظالم نے تیر پیہم پہ کبھی اِدھر سے کبھی اُدھر سے

آحقر بہاری کان پورسے آنے کے بعد بہار شریف میں قیام پذیر ہوئے اور علم باطنی کے حصول کی طرف رغبت ہوئی، تصوف کی طرف جھکاؤ ہوا اور خانقاہ اسلام پور کے مرشد کامل حضرت سید شاہ ولایت علی ہمدانی اسلام پوریؒ کے دست حق پرست پر بیعت ہوئے اور پھر ان کے دامن سے ایسے وابستہ ہوئے کہ ان کی شاعری بھی صوفیانہ رنگ میں رنگ گئی۔ داخلیت کا عنصر غالب آگیا۔ واردات قلبی اور معارف آگہی کی کیفیتیں ان کی شاعری پر غالب آگئیں اور اس کے بعد انہوں نے گویا شاعری ترک کردی اور کچھ کہا بھی تو اس میں تصوف کا رنگ و آہنگ ہے۔ ان کی ایک مشہور غزل ہے جس میں کیف و سرور کا آہنگ بھی ہے اور زبان و بیان کا رنگ بھی۔ چند اشعار ملاحظہ ہوں۔ ؎

پوچھا جو کسی نے آحقر سے کیوں شغلِ سخن کو چھوڑ دیا
بولے کہ گیا جب موسمِ گل، بلبل نے چمن کو چھوڑ دیا

چونکے نہ کسی دن خواب سے ہم غفلت میں بسر کی عمر اپنی
اے وائے غضب کب آنکھ کھلی جب روح نے تن کو چھوڑ دیا

جب باغ جناں میں تُو تیری اے رونقِ گلشن بھیل گئی
بلبل نے گلوں سے منہ موڑا، پھولوں نے چمن کو چھوڑ دیا

اے حبِّ وطن اللہ سے ڈر، بھولی ہوئی باتیں یاد نہ کر
اب تیری بلا سے بوم بسے جب تو نے چمن کو چھوڑ دیا

آئے ہیں عجب انداز سے وہ، ڈالے ہوئے رُخ پر بالوں کو
زلفیں جو ہٹیں اک شور ہوا، سورج نے گہن کو چھوڑ دیا

اب آنکھ کسی پر کیا ڈالیں، جچتا ہی نہیں نظروں میں کوئی
آنکھوں پہ تری صدقہ کرکے، جنگل میں ہرن کو چھوڑ دیا

آحقر کی دوسری غزل کے بھی چند اشعار ملاحظہ کیجئے۔ جس میں تصوف کے مختلف

حقائق پر روشنی ڈالی ہے۔ ؎

یہ عشق کی ہے سرکار احقرؔ، غصہ بھی یہاں ہے پیار بھی ہے
ہر زخمِ جگر کے پھاہے میں، کافور بھی ہے، زنگار بھی ہے
اے حضرتِ دل ناداں نہ بنو، رکھو نہ قدم اس کوچہ میں
یہ اس کی گلی کا رستہ ہے، پُر خوف بھی ہے، پُر خار بھی ہے
کیا مے میں ملایا ہے تونے، کیا بات ہے اس میں اے ساقی!
جو رند ہے اس میخانے کا، مدہوش بھی ہے ہشیار بھی ہے
یہ راز کی باتیں ہیں اس کو سمجھے تو کوئی کیوں کر سمجھے
انسان ہے پتلا حیرت کا، مجبور بھی ہے مختار بھی ہے
حیران ہے تیرے مذہب سے، سب گبر و مسلماں اے احقرؔ
یہ اس کی گلی کا رستہ ہے، پُر خوف بھی ہے، پُر خار بھی ہے
ڈرتا ہی رہے انساں اس سے، اُمید اگر ہے بخشش کی
ہیں نام اسی کے یہ دونوں، غفار بھی ہے، قہار بھی ہے

اِس غزل کو ملاحظہ کیجئے جس میں تصوف بھی ہے اور تغزل بھی ؎

کچھ فکر تمہیں عقبیٰ کی نہیں، احقرؔ یہ بڑی نادانی ہے
دنیا کی خوشی کیا، ایذا کیا، یہ حادثہ ہے وہ فانی ہے
کون آج چمن میں آیا ہے، کیوں بادِ صبا دیوانی ہے
سنبل ہے پریشاں حال جدا، نرگس کو الگ حیرانی ہے
قابو میں دل ناکام رہے، راضی بہ رضا انسان رہے
ہنگامِ مصیبت گھبرانا، اک طرح کی یہ نادانی ہے
ہے قلزمِ عشق اک قہر خدا، جو اس میں گرا وہ ڈوب گیا
اللہ رے اس کی گہرائی ساحل پہ گلے تک پانی ہے

اُمید نہیں اب کشتیٔ دل ساحل پہ سلامت جا پہنچے
دریائے الم بھی باڑھ پہ ہے اشکوں کی جدا طغیانی ہے [۵]

احقر بہاری نے ۱۳۴۲ھ میں پٹنہ میں انتقال کیا اور محلہ سلطان گنج میں سپرد خاک ہوئے لیکن ان کی قبر کا اب نام ونشان بھی نہ رہا۔ ان کے شاگردوں میں حضرت شفیع بہاری اپنے عہد کے ممتاز شاعروں میں شمار کیے جاتے تھے۔

---

۵ سبدگل: مرتبہ، رخشاں ابدالی (مخطوطہ) صفحہ ۳۵

شوق نیموی

جناب شوق نیموی کی شہرت کئی جہتوں سے ہندوستان گیر طور پر ہوئی۔ وہ شاعر بھی تھے اور شارح بھی، محدث بھی تھے اور ناقد و عروضی بھی، لیکن ان کی عظمت شاعر کی حیثیت سے دبستان عظیم آباد اور دبستان لکھنؤ میں زیادہ بڑھی۔ آپ کا اسم شریف محمد ظہیر احسن اور شوق تخلص ہے۔ آپ کا وطن مالوف موضع نیمی ضلع پٹنہ ہے۔ آپ شیخ سبحان علی کے صاحبزادے تھے۔ آپ کی ولادت باسعادت ۱۲۷۸ھ میں ہوئی۔ ابتدائی تعلیم گھر ہی پر ہوئی اور جب اشتیاق تعلیم نے زور کیا تو مزید تعلیم کے لیے شہر عظیم آباد پہنچے اور شمس العلماء مولانا محمد سعید حسرت عظیم آبادی کے زیر تعلیم رہے۔ ۱۲۹۶ھ میں غازی پور پہنچے اس زمانے میں وہاں کے مدرسہ چشمۂ رحمت کی بڑی شہرت تھی۔ علامہ شبلی نعمانیؒ نے بھی فاروق چڑیا کوٹی سے وہیں تعلیم حاصل کی تھی۔ مولانا مفتی رحمت اللہ فرنگی محلی اس کے مہتمم اور صدر مدرس تھے۔ حسن اتفاق سے اسی زمانے میں مولانا محمد عبدالاحد شمشاد لکھنوی بھی فرنگی محل سے آکر اسی مدرسے کی تعلیم و تدریس میں

مشغول ہو گئے بلکہ درجہ فارسی کے مدرس اول تھے۔ شوق کو ان سے استفادہ کا زیادہ موقع ملا اور غازی پور میں جو مشاعرہ ہوتا تھا اس میں بھی شمشاد لکھنوی کے ساتھ شریک ہونے لگے۔ شعر فہمی اور سخن سنجی کے فطری ذوق نے انگڑائی لی اور انہیں شمشاد لکھنوی میں وہ کمالِ فن نظر آیا کہ ذوقِ شعری کی آبیاری کے لیے انہیں کو اپنا استاد تسلیم کیا، اور انہیں سے اصلاحِ سخن لینے لگے۔ شمشاد لکھنوی، آسی غازی پوری کے شاگرد رشید تھے اور آسی غازی پوری کا سلسلۂ تلمذ بیک واسطہ ناسخ لکھنوی تک پہنچتا ہے اس لیے دبستانِ لکھنؤ سے وابستہ ہو گئے اور ان سے خوب خوب استفادہ کیا۔ اسی زمانے میں منشی امیر اللہ تسلیم لکھنوی (جو جناب نسیم دہلوی کے ارشد تلامذہ میں سے تھے) کی شہرت زیادہ ہو رہی تھی اور ان کی مثنوی شامِ غریباں اور کلیاتِ تسلیم کا مطالعہ کیا تو ان کی شاگردی کا خیال بھی دل میں پیدا ہوا۔ وہ والیٔ رام پور کے یہاں وابستہ تھے۔ ان کی خدمت میں بھی چند غزلیں اصلاح کے لیے بھیجیں۔ اثنائے تعلیم میں شوق نیموی تحصیل علم کے لیے پھر لکھنؤ گئے اور مولانا عبدالحی فرنگی محلی کے حلقۂ درس میں بھی شریک ہوا کرتے۔ اثنائے تعلیم میں لکھنؤ کے مشاعروں میں بھی شرکت کرنے لگے جہاں ان کی کافی شہرت اور مقبولیت ہونے لگی۔ اسی زمانے میں "نغمۂ راز" نام کی ایک مثنوی بھی جو اشاعت پذیری کے بعد قدر کی نگاہوں سے دیکھی گئی۔

اس کے بعد آپ کو نواب کلب علی خاں والیٔ ریاست رام پور نے آپ کو اپنے دربار میں بلا کر قدر و منزلت سے سرفراز فرمایا۔ کچھ چھوٹے چھوٹے رسالے بھی تصنیف کیے جس میں اپنے عہد کے مشہور شاعر جلال لکھنوی سے اختلاف ہو گیا اور ادبی چشمک شروع ہو گئی۔ دونوں طرف سے ادبی معرکہ آرائیاں ہوئیں اور اس سلسلہ میں شوق نیموی کی شہرت بھی ہوئی اور مقبولیت بھی۔ لکھنؤ والوں نے بھی اس ادبی معرکہ میں شوق نیموی کو برحق تسلیم کیا۔ پھر دونوں میں صلح صفائی ہو گئی۔

شوق نیموی علمی اور فنی دنیا میں مجموعۂ کمالات کا درجہ رکھتے تھے۔ آخر یہ صوبۂ بہار کا دُرِّ نایاب اور شاعرِ بے بہا ۱۳ صفر ۱۳۲۲ھ مطابق ۱۹۰۴ء کو

اس دار فانی سے سفر آخرت اختیار کیا۔

علامہ شوق نیموی کو دنیائے علم و ادب محدث، فقیہہ، کامل فن، مثنوی نگار غزل گو شاعر کے اعتبار سے جانتی ہے لیکن کچھ ہی لوگ ایسے ہیں جو انہیں صوفی شاعر کی صف میں بھی جگہ دیتے ہیں۔ وہ عالم دین بھی تھے اور مشہور بزرگ حضرت مولانا فضل رحمان گنج مرادآبادی علیہ الرحمہ کے دست گرفتہ بھی تھے اور ایک کیفیت میں گنج مرادآباد جاکر ان کے دست حق پرست پر بیعت ہوئے۔ جس کی تفصیل انہوں نے اپنی تصنیف میں لکھی ہے۔ اس کے علاوہ وہ مشہور بزرگ اور صوفی شاعر حضرت آسی غازی پوری کے فیض یافتہ بھی تھے اور خود ان کے استاد شمشاد لکھنوی بھی ان کے ارشد تلامذہ تھے پھر کوئی وجہ نہ تھی کہ صوفیانہ ماحول اور مزاج کے ہوتے ہوئے بھی تصوف سے ہمکنار نہ ہوتے۔

حضرت آسی بھی دبستان لکھنؤ سے وابستہ ہوتے ہوئے بھی خارجیت سے ہمکنار نہ ہو سکے۔ داخلیت جس میں عشق حقیقی اور واردات قلبی کی ہم آہنگی ہے وہ ان کی شاعری کا طرۂ امتیاز ہے۔ استاد کا یہی رنگ شمشاد لکھنوی میں بھی آیا اور اسی ذوق شعری سے شوق نیموی بھی ہم کنار ہوئے۔ آسی کی مشہور غزل ہے، جس کا یہ مقطع بڑی مقبولیت اور شہرت کا حامل ہے ؎

حشر میں منہ پھیر کر کہنا کسی کا ہائے ہائے
آسی گستاخ کا ہر جرم نابخشیدہ ہے

شمشاد لکھنوی نے بھی اسی زمین میں غزل کہی ہے اور اسی کی اتباع میں شوق نے بھی ایک غزل کہی ہے، جس کا مطلع یہ ہے ؎

سوز غم سے آبلہ اپنا دل تفتیدہ ہے
اور سارا جسم شکل موئے آتش دیدہ ہے

اور اس کا مقطع یہ ہے ؎ کر تجسس گوہر مقصود مل جائیں گے شوق
دل کے ویرانے میں گنج معرفت پوشیدہ ہے

مذکورہ بالا دونوں اشعار اس حقیقت کی غمازی کرتے ہیں کہ شوق نیموی صوفی شاعر کی حیثیت سے بھی قابل عظمت ہیں۔ شوق نیموی کی ایک غزل ملاحظہ کیجئے جس میں وحدت الشہود کے مسلک کو بھی پیش کیا ہے اور حقائق و معارف کی مختلف کیفیتیں بھی اس میں پوشیدہ ہیں ؎

دل میں ہے یا دِ تیری آنکھوں میں نور تیرا
جس گھر کو میں نے دیکھا پایا ظہور تیرا

جلوہ ترا عیاں ہے پستی ہو یا بلندی
پھولوں میں بُو ہے تیری تاروں میں نور تیرا

یہ سر ترے قدم پر یوں ہی پڑا رہے گا
جب تک نہ تو کہے گا بخشا قصور تیرا

گردن جھکانے میں بھی کیا سربلندیاں ہیں
پایا مراقبے میں اکثر حضور تیرا

کہتا ہوں صدق دل سے دونوں کو خوشنما ہیں
مجکو تو عجز میرا تجکو غرور تیرا

اپنی رگِ گلو سے پایا قریب تجکو
غفلت یہ تھی کہ رستہ سمجھے تھے دور تیرا

اپنے کرم کے صدقے محشر میں بخش دینا
ہے اک ذلیل بندہ شوق اے غفور تیرا [۵۱]

لکھنؤ کے قیام کے دوران ایک مشاعرے میں شوق نیموی نے اپنی ایک غزل پڑھی جو بہت مقبول ہوئی اور شیخ محمد جان شاد لکھنوی نے مشاعرے کے بعد فرمایا کہ "یہ مشاعرہ شوق نیموی ہی کے ہاتھ رہا۔ اس غزل کے بھی چند منتخب اشعار ملاحظہ کیجئے ؎

جنوں میں ایک دن ڈنکا بجے گا جوشِ ایماں کا
ہے الّا اللہ آوازہ مرے چاک گریباں کا

ورق مجھ کو جو ہاتھ آجائے خورشید درخشاں کا
تو لکھوں وصف روئے پاک کچھ محبوب یزداں کا

خیالِ تن نہ پھر آیا جو نکلی روح قالب سے
رہا ہو کر نہ دیکھا خواب بھی یوسف نے زنداں کا

---

۵۱ تذکرہ مسلم شعرائے بہار حصہ دوم ص ۱۳۳

کسی کا صانع کونین کھینچے گا مگر نقشہ
ورق سادہ پڑا ہے آج تک مہرِ درخشاں کا
عجب شاداب ہے لاکھوں گلِ زخم اس میں کھلتے ہیں
نہالِ دل مرا سینچا ہوا ہے آبِ پیکاں کا
ہوئے اربابِ محفل خوش خدا نے آبرو رکھ لی
کہ تھا شوقِ امتحاں اس دم تری طبعِ سخنداں کا

حضرت مشرقی منیری

احتشام الدین حیدر آپ کا اسم شریف اور تخلص مشرقی ہے۔ آپ کا وطن مالوف بزرگوں کا مشہور مسکن، منیر شریف ہے۔ آپ کے والد کا نام سید شاہ خلیل الدین احمد اور تخلص جوشؔ ہے۔ آپ عبدالغفور نساخ کے شاگرد تھے۔ نانیہالی اعتبار سے مخدوم احمد یحیٰی منیریؒ کی اولاد میں ہیں اور دادیہالی اعتبار سے حضرت بابا فرید گنج شکرؒ کی اولاد میں ہیں۔ آپ کی ولادت باسعادت ۱۲۸۲ھ میں ہوئی۔ آپ کی ابتدائی تعلیم صوفی منیریؒ سے ہوئی۔ اس کے بعد مولانا سید محمد رفیق صاحب سے بھی اسلام پور میں تعلیم حاصل کی۔ اور تمام علوم و فنون کی تکمیل حکیم عبدالحمید پریشاں عظیم آبادی سے ہوئی۔ آپ شاعر و نثار ہر دو حیثیت سے مشہور ہیں۔ ابتدا میں صافی تخلص کرتے تھے، بعد میں مشرقی تخلص اختیار کیا۔ آپ کو شرف تلمذ صوفی منیری سے حاصل ہے اور رموز شاعری کا اکتساب بھی انہی سے کیا۔

مشرقی منیری نے کچھ اپنے حالات قلمی بیاض میں قلم بند کیے ہیں، جو کتب خانہ

قادریہ خانقاہ اسلام پور کی زینت ہے، اسی سے اقتباس پیش کیا جاتا ہے :۔

"میں بارہ برس کا تھا اور میری طالب العلمی کا زمانہ تھا کہ اتفاقاً ایک دن شعر مناجات میں میری زبان سے نکلا، جو فارسی میں تھا۔ مجھے تعجب ہوا اور لوگوں کو سنایا تو بہت کچھ داد ملی۔ پھر تو تحسین کا مزا ملا کہ اسی وقت سے الفاظ جوڑ جوڑ کر لگا شعر بنانے اور جب پڑھنے سے فرصت ملتی تو شعر گوئی میں اوقات صرف کرتا ... اونیسویں برس کی عمر میں تحصیل درسی سے جو طب کے سوا ابھی تمام ہونے بھی نہ پائی تھی اتفاقاً مجھے چھوڑ کر الگ ہونا پڑا۔ اب تو میں تھا اور فکر سخن، دن رات یہی خیال تھا اور یہی سودا تھا۔ چونکہ طبیعت خداداد اور موزوں واقع ہوئی تھی اور کتب بینی کا بھی شوق تھا۔ زمانہ طالب العلمی میں مجھے حسن و قبح شاعری پر تھوڑے ہی دنوں میں اچھی اطلاع ہو گئی۔ اپنے کلام پر آپ نظر غامض ڈالتا اور اس کی جانچ پڑتال خود کرتا۔ اس زمانے میں مجھے شاعری اور اس کی تحقیقات کی طرف کچھ ایسا انہماک تھا جسے مالیخولیا کہنا ہرگز بیجا نہ ہوگا ... میری نظر میں مشاہیر حضرات کے کلام بھی لفظی و معنوی لغزشوں سے خالی کم نظر آتے تھے۔

الغرض چھ برسوں کی شعر گوئی پر جس وقت میرا سن چھبیس[۲۵] برس کا تھا اپنے اگلے پچھلے کلام کو جو ترتیب دیا تو اُردو کا ایک ضخیم دیوان مرتب ہوا جو دس ہزار شعروں کا مجموعہ تھا۔ جس میں قطعات و ترکیب بند و رباعیات و قصائد و تاریخ و غزلیات و مثنوی وغیرہ اصناف سخن کے معتد بہ ذخیرہ تھے۔ ترتیب دیوان کے بعد اسی مالیخولیا نے مجھ سے تحقیقات الفاظ سے متعلق ایک رسالہ لکھوالیا۔ جس میں معنوی لغزشیں بھی ہم عصر مشہور زبان آوروں کے

کلام کی عرض کی گئیں تمام کرنے کے بعد یہ خیال آیا کہ ... چونکہ اکثر حضرات کے کلام پر نکتہ چینی ہوئی ہے۔ بجز آزار دل جس سے بڑھ کر کوئی گناہ نہیں اس سے کچھ بھی منفعت کی امید نہیں۔ اگرچہ اکثر احباب اس رسالہ کو دیکھ چکے تھے، میں نے اسے زمین میں مدفون کر دیا لیکن اس سے دل کو تسکین نہیں ہوئی اور اپنے کیے پر دل کو کچھ ایسی ندامت کا سامنا ہوا کہ ... ایک روز مجھے وحشت نے آگھیرا ... اپنے کل کلام نظم کا دفتر رسی سے اینٹوں کے ساتھ باندھ کر حضرت شیخ دولت منیریؒ کے تالاب میں قد آدم پانی میں جا کر ڈبو دیا اور اس طرح اپنے سیہ ناموں کے دھو ڈالنے کے خیال سے فی الجملہ دل کو تسکین دی۔ بعد کو احباب کے اصرار سے پھر حافظہ کی مدد سے ترتیب دیوان میں مصروف ہوئے۔ حافظہ سے دوبارہ یاد آئے ہوئے تکمیل کے لیے کچھ بڑھائے ہوئے اور کچھ تازہ کلام ان سب سے مل ملا کر موجودہ دواوین کا مجموعہ مرتب ہوا ہے۔

اس سلسلے میں آپ نے دو شعر بھی لکھا ہے ؎

میرے اشعار تھے تعداد میں چالیس ہزار
ایک بھی ان میں سے یاد نہیں آتا دل میں

فارسی میں بھی تھے اردو میں بھی تھے اپنے کلام
سب کو کھو بیٹھے جو سودا تھا عرب کا دل میں" [1]

میں نے قبل عرض کیا ہے کہ حضرت مشرقی منیری، حضرت منیریؒ کے شاگرد ہیں اور ان کے والد جوش منیری اور صوفی منیریؒ دونوں اپنے خالہ زاد بھائی تھے۔

---

[1] حضرت صوفی منیری کے نثری کارنامے ص ۵۳ : مصنف ڈاکٹر طیب ابدالی

مشرقی منیریؒ کو صوفی منیریؒ سے ارادت بھی تھی اسی لیے مشرقی منیری کے کلام میں تصوف کا گہرا امتزاج ہے۔ لیکن ان کی غزلوں میں عشق حقیقی کے ساتھ ساتھ عشق مجازی کا بھی گہرا رنگ ہے اور وہ غلبہ تصوف پر غالب آ گیا۔ مشرقی منیری کی ایک غزل کے چند اشعار ملاحظہ کیجئے ؎

آباد کبھی اپنا بھی ویرانۂ دل تھا
اک شمع سے پُر نور تھا، کاشانۂ دل تھا

لوٹا گیا تھا ایک خزانہ سے جو معمور
ہے اب تو خرابہ وہی جو خانۂ دل تھا

سنگِ ستمِ چرخ سے مے خاک نے پی اور
یکلخت ہوا چور جو پیمانۂ دل تھا

خود ہو گیا افسانہ وہی کس سے کہیں اب
مرغوب ہمارا جسے افسانۂ دل تھا

کیوں مشرقیؔ غمزدہ کا دل نہو بے چین
اب قبر کی ہے جان جو جانانۂ دل تھا[1]

مشرقی منیری کے صوفیانہ اشعار میں بھی تغزل کا رنگ گہرا ہے اسی نے ان کے صوفیانہ خیالات کو مغلوب کر دیا ہے ورنہ وہ علمی اور عملی دونوں اعتبار سے صوفی صافی تھے۔ ان کی ایک غزل کے چند اشعار اور ملاحظہ کیجئے ؎

رہِ حرم کے لیے کوچۂ بتاں کے لیے
نہ خاک اُڑاتے پھرے ہم کہاں کہاں کے لیے

مٹایا ہم نے نشاں اپنا بے نشاں کے لیے
مکان پھونک دیا اپنا لامکاں کے لیے

جب اپنے کھونے سے ملتی ہے منزلِ مقصود
نشانِ راہ کہاں میرے کارواں کے لیے

طریقِ عشق میں رہبر ہے اپنی خاموشی
جرس کا کام نہیں میرے کارواں کے لیے

مشرقی منیری کا یہ مشہور شعر ہے ؎

کعبہ جاتے تھے سرِ راہِ بتاں بیٹھ گئے
ہائے جاتے تھے کہاں اور کہاں بیٹھ گئے

اور موصوف کے یہ دو اشعار بھی قابل توجہ ہیں ؎

---

[1] سبد گل ص ۶۱ مرتبہ: رخشاں ابدالی

ہم بس میں ہیں ان کے تو وہ کیا کیا نہ کریں گے | بدنام تو فرمائیں گے رسوا نہ کریں گے
توبہ ہے کہ اب سے کبھی توبہ نہ کریں گے | اے پیر مغاں! کعبہ سے ہم آئے ہیں نادم

مشرقی منیری کا وصال ۱۳۴۳ھ میں منیر شریف میں ہوا، اور اپنے خاندانی آرام گاہ یعنی چھوٹی درگاہ منیر شریف میں مدفون ہوئے۔

واعظ عظیم آبادی

واعظ الدین حسن آپ کا نام اور واعظ تخلص ہے۔ آپ کے آبا و اجداد خراسان کے رہنے والے تھے۔ آپ کے مورث اعلیٰ شاہ محمد الیاس رضوی خراسانی محمد بختیار خلجی کے عہد میں خراسان سے ہندوستان تشریف لائے جب بختیار خلجی نے بہار کو فتح کیا تو شاہ الیاس خراسانی کا عظیم آباد کی صوبیداری پر تقرر ہوا۔ اس عہدے پر فائز ہونے کے بعد انہوں نے یہیں شادی کر لی اور شاہ محمد الیاس کے فرزند محمد یوسف نے اپنے نام پر موضع یوسف پور آباد کیا۔ اسی میں مستقل بود و باش اختیار کر لی۔ [۱]

"تذکرہ مسلم شعرائے بہار" میں آپ کے سلسلے میں ایک اہم بات اور تحقیق طلب مسئلہ کو پیش کیا ہے جس کی عبارت پیش خدمت ہے:-

> "آپ کے مورث اعلیٰ شاہ محمد الیاس رضوی ملک بختیار خلجی کے عہد میں خراسان سے ہندوستان تشریف لائے اور سید محمد ابراہیم ملک بیوؔ کی بہن سے شادی کی۔ اس لیے اس خاندان کے لوگ ملک بھی کہے جاتے ہیں۔ ترکی زبان میں بیوؔ داماد کو کہتے ہیں۔

---

[۱] واعظ عظیم آبادی، مقالہ رخشاں ابدالی، مطبوعہ قومی زبان کراچی ۲۲ نومبر ۱۹۷۸ء

"چونکہ سید محمد ابراہیم کی شادی ملک بختیار خلجی کی بیٹی سے ہوئی تھی،
اس لیے وہ ملک بیّو کہے جاتے تھے۔ یعنی بادشاہ کے داماد، شاہ
محمد الیاس کے فرزند شاہ محمد یوسف نے اپنے نام پر موضع یوسف پور
آباد کیا۔ یہیں شاہ محمد الیاس کا مزار ہے۔" [۱]

آپ کی ولادت ۱۲۸۸ھ میں عظیم آباد کے محلہ صدر گلی میں ہوئی۔ آپ کے والد مولانا سید عبدالرحمان بن سید شاہ احمد حسین رضوی تھے۔ واعظ کی ابتدائی تعلیم گھر ہی پر ہوئی۔ عربی و فارسی کی تعلیم عالم روزگار شاعر باکمال مولانا حکیم عبدالحمید پریشاں سے حاصل کی جو ڈاکٹر عظیم الدین عظیم کے نانا تھے۔ حقیقت تو یہ ہے کہ درسیات متداولہ کے علاوہ فن شاعری کی تعلیم بھی آپ ہی سے حاصل کی۔ پٹنہ میں وہ زمانہ شعر و شاعری کا تھا۔ بزم مشاعرہ کا آئے دن انعقاد ہوتا تھا۔ اس میں شرکت کا موقع ملا۔

واعظ کے اندر شاعری کا فطری ذوق تھا۔ اس لیے آپ کے شوق میں شدت پیدا ہوئی اور استاد کی تلاش ہوئی۔ جس سے اصلاح سخن لینے اور مشورہ سخن کرتے چنانچہ مرزا غالب کے شاگرد الوار عالم شاہ پر نگاہ انتخاب پڑی اور آپ کے حلقۂ تلمذ میں آئے۔ حضرت شاہ کی اصلاح و تربیت نے واعظ کو درجہ کمال تک پہنچا دیا۔ آپ کو تاریخ گوئی میں کمال حاصل تھا اور تاریخیں بربیہہ و برجستہ کہا کرتے تھے۔ فارسی میں بھی دستگاہ تھی اور فارسی غزلیں خوب کہتے تھے۔ آپ کا وصال ۱۳۵۲ھ میں پٹنہ میں ہوا اور وہیں مدفون ہوئے۔

واعظ کو فن شاعری پر قدرت تھی۔ بلکہ قادر الکلام تھے افسوس کہ آپ کا اردو کلام ضائع ہو گیا۔ اردو شاعری میں صنف رباعی بھی ایک اہم صنف ہے۔ واعظ نے صوفیانہ انداز کو کس انداز سے پیش کیا ہے ملاحظہ کیجیے۔

---

[۱] تذکرہ مسلم شعرائے بہار حصہ پنجم ص ۱۱۹

تجھ سا کوئی جان جاں نہیں دیکھا ہے
کس شئی میں تجھے عیاں نہیں دیکھا ہے

کعبہ میں حرم میں، بتکدہ میں، دل میں
جلوہ ترا کہاں نہیں دیکھا ہے

اور دوسری رباعی بھی ملاحظہ کیجئے ؎

ہے نزع کا وقت اپنا دم گھٹتا ہے
اور نقدِ حیات بھی مرا لٹتا ہے

کیونکر نہیں گھبرائے طبیعت واعظ
جس گھر میں پلا ہوں آج وہ چھٹتا ہے

واعظ کے کلام میں تصوف کا ایسا رنگ ہے جو عشق سے ماورا ہو کر دعوت فکرو عمل دیتی ہے۔ ایک غزل کے چند اشعار ملاحظہ ہوں ؎

جیتے دم تک گردشِ افلاک ہے
مر گئے جب ہم تو قصہ پاک ہے

دشتِ غربت میں کس سے مشورے
ایک دل ہے وہ بھی حسرت ناک ہے

دل لگا کر سُن تو واعظ کا کلام
اس کا ہر ہر لفظ عبرت ناک ہے

ایک اور غزل واعظ کی ملاحظہ کیجئے جس میں واعظ نے رنگِ تغزل اور آہنگ تصوف کا انزاج کیا ہے ؎

یہ کیوں کہوں مجھے رسوا و خوار تو نے کیا
جو کچھ کیا وہ مرے دل کی آرزو نے کیا

قصور اس میں کسی کا نہیں ہے، اے گلِ سُرخ
جُدا چمن سے ترے رنگ و بو نے کیا

گذر کے سرحدِ امکاں سے دیکھی راہِ بقا
بڑا یہ کام مرا تیری جستجو نے کیا

لہو کے چھینٹوں سے دامن کسی کا پاک رہا
بڑا ادب تہِ خنجر رگِ گلو نے کیا

اور اس غزل کے بھی چند اشعار ملاحظہ فرمائیے۔ جس میں شاعر نے صوفیانہ خیالات کو اچھوتے انداز میں پیش کیا ہے ؎

درد الفت دل سے جب مفقود ہے
موت سے بدتر یہ ہست و بود ہے

راہ رو کیا شوق صادق چاہئے
ہر قدم پر منزل مقصود ہے

اپنی بینائی کا ہے سارا قصور
ورنہ وہ تو ہر جگہ موجود ہے

آب کوثر کی تجھے واعظ ہے فکر
مجھ کو شوق آتشِ بے دود ہے

عرفاں اسلام پوری

صوبۂ بہار میں غالب کے شاگردوں کی کمی نہیں ہے۔ ان میں حضرت صوفی منیریؒ تصوفانہ رنگ و آہنگ کے اعتبار سے غالب کے ممتاز شاگردوں میں سے ایک ہیں اور حضرت صوفی منیریؒ کے شاگردوں میں سے ایک ممتاز شاگرد عرفاں اسلام پوری ہیں۔ جن کے شاگردوں کا حلقہ وسیع رہا۔

آپ کا اسم شریف اکرام الدین احمد اور تخلص عرفاں ہے۔ آپ حضرت مخدوم جہاں شیخ شرف الدین احمد یحییٰ منیریؒ کے عم زادہ اور خلیفہ کی اولاد میں سے ہیں۔ آپ کے والد ماجد کا نام شاہ معین الدین احمد ہے۔ جن کا آبائی وطن شیخپورہ ضلع مونگیر ہے۔ اسلام پور کے رئیس چودھری ظہور الحق صاحب کے عرفاں اسلام پوری نواسے تھے۔ اور اسی وجہ سے آپ کے والد نے اسلام پور میں مستقل سکونت اختیار کی۔

عرفاں اسلام پوری کی ولادت ۱۲۹۱ھ مطابق ۱۸۷۴ء میں اسلام پور ہی میں ہوئی۔ آپ کے نانا چودھری ظہور صاحب نے آپ کی تعلیم و تربیت پر خصوصی توجہ کی اور صوفی صافی اور جید عالم روزگار حضرت مولانا حکیم الحاج سید محمد رفیق صاحب شہباز پوریؒ (جو کہ حضرت امداد اللہ مہاجر مکی اور عبدالحق مہاجر مکی سے مدینہ منورہ میں اکتساب فیض کیا تھا اور خانقاہ اسلام پور کے پیر طریقت اور مرشد کامل حضرت سید شاہ ولایت علی ہمدانی اسلام پوریؒ کے مرید و مجاز تھے) سے تعلیم و تربیت حاصل کی۔ مختلف علوم و فنون کے ماہر تھے۔ مولانا سید سلیمان ندوی کے والد حکیم ابوالحسن صاحب سے بھی اکتساب فیض کیا۔ شاعری کا شوق کارفرما تھا لیکن طبیعت میں علو ہمتی بھی تھی اس لیے آپ نے اصلاح سخن غالب کے شاگرد حضرت صوفی منیریؒ سے لی اور باضابطہ فن شاعری میں اکتساب فیض کرتے رہے،

لیکن آپ کے معاصرین میں زیادہ تر داغ کے شاگردان تھے۔ اس لیے آپ کو داغ کا رنگ پسند آیا اور زبان میں داغ کے رنگ کی پیروی کی۔ اپنے استاد صوفی منیریؒ سے اتنی عقیدت تھی کہ "یک در گیر و محکم گیر" پر عمل پیرا رہے۔ حضرت صوفی منیریؒ کے بڑے صاحبزادے سید شاہ عبدالقادر اسلام پوریؒ کے دست حق پرست پر بیعت بھی ہوئے۔ اس کے بعد سے تصوف کا رنگ آپ پر غالب آگیا۔ آپ کی شاعری میں غزل کی چاشنی، زبان کی دل آویزی اور تصوف کی دل گداختگی اور رنگارنگی بدرجۂ اتم موجود ہے۔ وحدت الوجود اور وحدت الشہود کا مسلک جو تصوف کا اہم ترین مسئلہ ہے۔ عرفان اسلام پوری کے ان اشعار میں ملاحظہ کیجئے ؎

عاشق ہے گل عذار کس کا — دل اس کا ہے داغدار کس کا

ہر گل میں یہ سب بہار کس کی — ہے سنگ میں یہ شرار کس کا

نسبت تو ہے بس اسی سے سب کو — گل اس کے ہوئے تو خار کس کا

عزت ہے مری تو بس یہی ہے — وہ پوچھیں کہ تو ہے خوار کس کا

روکے اسے عشق و عاشقی سے — ہے دل پر یہ اختیار کس کا

یہ حال کھلا نہ کچھ بھی عرفاںؔ
ہے تجھ کو یہ انتظار کس کا

اور ایک غزل کے اشعار ملاحظہ کیجئے ؎

سرچشمۂ معانی ذوق خیال تیرا — معنیٔ زندگانی شوق وصال تیرا

دل خونِ کُن عزیزاں شورِ جلال تیرا — مجموعۂ بہاراں رنگِ جلال تیرا

ادراک سے منزہ یارب ہے ذات تیری — کیا کر سکے تصور فکرِ خیال تیرا

مرکر ملے گی عرفاںؔ تجھ کو حیاتِ تازہ
تیرے زوال میں ہے پنہاں کمال تیرا

حضرت عرفان اسلام پوری کے کلام میں تصوف کی چاشنی بھی ہے اور زبان کی دل آویزی بھی، اس لیے ان کا کلام دوآتشہ بن گیا ہے۔ ایک غزل کے

تین اشعار اور ملاحظہ کیجئے ؎

اس کا جلوہ تو عیاں ہے کوئی مستور نہیں
دیکھ لے آنکھ مگر اس کو یہ دستور نہیں
کبھی جلنے کا نہیں لاکھ ہوں جلوے اس پر
ہے یہ نخلِ دلِ عاشق شجرِ طور نہیں
کیوں نہ دوزخ بھی ہو جنّت مجھے جب خود وہ کہے
اس گنہگار کو لے جاؤ یہ مغفور نہیں

آپ کا وصال ۱۳۷۳ھ مطابق ۱۹۵۳ء میں اسلام پور میں ہوا، اور اپنے پیر کے آستانے میں مدفون ہوئے۔ آپ پر اور آپ کی شاعری پر تحقیقی کام ہو چکا ہے۔ آپ کے شاگردوں میں نیّر ابدالی اسلام پوری اور رخشاں ابدالی مشہور و معروف ہیں۔

نسیمؔ ہلسوی

داغؔ دہلوی کا حلقۂ تلمذ صوبۂ بہار میں بہت وسیع رہا۔ ان کے شاگردان بہار بھی عظیم المرتبت شعراء تسلیم کیے گئے، ان میں نسیم ہلسوی ایک ہیں۔ آپ کا اسم شریف محمد نظیر احسن اور تخلص نسیم ہے۔ آپ کے والد ماجد حاجی حکیم سید شاہ محمد امین اکبر قادری کاکوی ہیں۔ آپ قصبہ ہلسہ ضلع پٹنہ (جو اسلام پور اور فتوحہ کے درمیان ہے) کے رہنے والے تھے۔ نسیم ہلسوی حضرت حاجی سید شاہ محمد سجاد داناپوری رحمۃ اللہ علیہ کے حقیقی نواسا تھے اس لیے تصوف کا فیضان ان کے رگ و پے میں تھا۔ آپ کی ولادت باسعادت ۱۲۹۲ھ میں اپنے وطن مالوف قصبہ ہلسہ میں ہوئی۔

(ہلسہ ایک ایسی بستی ہے جس میں سلسلہ مداریہ کے مشہور بزرگ جمال الدین جان من جنتی جو حضرت بدیع الدین مدار مکن پور کے خلیفہ ہیں، کا تاریخی مقبرہ ہے) آپ کی ظاہری تعلیم مولانا حافظ حسام الدین صاحب عظیم آبادی سے ہوئی اور عربی کی تعلیم مولانا شمس الحق محدث ڈیانوی سے مکمل کی۔ اور آپ کی باطنی تعلیم حضرت مولانا الحاج سید شاہ محمد اکبر ابوالعلائی سجادہ نشین خانقاہ داناپور سے ہوئی۔ آپ طبیب حاذق بھی تھے اور ہلسہ میں طبابت کرتے تھے۔ خانقاہ اسلام پور سے دلی اور گہرا لگاؤ تھا۔ اس لیے عرس اور مشاعرہ کے علاوہ بھی وہاں برابر تشریف لے جاتے اور یہ اس لیے بھی تھا کہ وہاں شعراء کی اچھی خاصی تعداد تھی۔ آپ کے ذوق کی تسکین ہوتی۔ آپ کا وصال ۱۳۳۷ھ مطابق ۱۹۱۹ء میں ہوا۔

نسیمؔ ہلسوی کو داغ دہلوی سے شرف تلمذ حاصل تھا۔ اس لیے زبان و بیان میں آپ کا رنگ اور آہنگ نمایاں ہے خود ڈاکٹر مبارک عظیم آبادی تلمیذ داغ دہلوی آپ کے بارے میں فرماتے تھے کہ نسیمؔ ہلسوی کو اگر جانشین داغ کہا جائے تو مناسب ہوگا۔ نسیمؔ ہلسوی میں ایک طرف زبان و بیان کا رنگ تھا تو دوسری طرف تصوف کا آہنگ بھی اگرچہ صوفی شاعر کی حیثیت سے وہ مشہور نہ ہو سکے لیکن ان کے کلام میں اس میں اس کا گہرا امتزاج ہے۔ یہ دو اشعار ملاحظہ کیجئے ؎

روداد مختصر ہے یہ لیل و نہار کی
دن شوق کا تو رات ترے انتظار کی

تکیہ کرے تو آدمی اللہ پر کرے
امید ہو تو رحمت پروردگار کی

اور ذرا ان دو شعروں کو بھی دیکھئے زبان و بیان کی چاشنی کے ساتھ ساتھ تصوف کی ایمائیت بھی کس طرح جھانکتی ہے۔ ؎

ارادہ دل کا صورت دیکھ کر ادراک فرمانا
اسی کو کشف کہتے ہیں یہی روشن خیالی ہے

اسی کوچہ میں رہ جاؤں گا خاکِ آستاں ہو کر
انہیں قدموں کے نیچے آرزوئے پائمالی ہے

اور اس شعر کی داد دیجئے ؎

نالہ کیسا اُف بھی نہ کرنا حکم یہ ہے تسلیم و رضا کا

بوالہوسوں کا کام نہیں شیوہ ہے یہ اہلِ وفا کا

موصوف کے اس شعر میں شانِ حق دیکھئے اور اس کی چاشنی سے لذت حاصل کیجئے

؎ شانِ حق دیکھئے اس خاک کے پتلے میں نسیمؔ

ایک مجموعہ ہے انسان خود احسانوں کا

نسیمؔ ملسوی کی ایک غزل کے چند اشعار پیش کیے جاتے ہیں جن میں عشق مجازی اور عشق حقیقی کا گہرا امتزاج ہے اور بظاہر یہ انداز بیان سے کچھ اور بات نظر آتی ہے مگر غور و فکر کے بعد کسی اور حقیقت کی تہ تک پہنچتے ہیں، ملاحظہ ہو ؎

غصہ میں ملاتا ہے کب ان سے نظر کوئی

تیور یہی کہتے ہیں دیکھے نہ ادھر کوئی

تصویر تمہاری ہے یا تم ہو خدا جانے

اک عالمِ حیرت میں ہے پیشِ نظر کوئی

یادِ رخ و گیسو میں یوں روز گذرتی ہے

میرے دل و دیدہ میں ہے پیشِ نظر کوئی

اللہ کی رحمت سے اُمید بہت کچھ ہے

میرے لیے اے ناصح اندیشہ نہ کر کوئی [1]

---

[1] سبد گل مرتبہ رخشاں ابدالی (مخطوطہ) صفحہ ۲۹

حضرت سید شاہ سید علی کامل اسلام پوریؒ

حضرت سید شاہ سید علی کامل اسلام پوریؒ کا خاندان علم و فضل اور بزرگی و درویشی کے اعتبار سے صوبہ بہار میں شہرت و عظمت کا حامل ہے۔ آپ حضرت امام جعفر صادقؓ کے صاحبزادے امام محمد دیباجؒ کی اولاد میں سے ہیں اور آپ کے نانا حضرت سید شاہ ولایت علی ہمدانی ابوالعلائیؒ خانقاہ اسلام پور کے سجادہ نشین تھے۔ جن کا نسب نامہ پدری امیر کبیر حضرت سید علی ہمدانیؒ مبلغ کشمیر تک منتہی ہوتا ہے اور نسب نامہ مادری حضرت مخدوم جہاں شرف الدین یحییٰ منیریؒ اور آپ کے سجادہ نشیں حضرت مخدوم حسین نوشہ توحید بلخیؒ برادر زادہ حضرت مولانا مظفر بلخیؒ تک پہنچتا ہے اس اعتبار سے آپ خاندانی حیثیت سے علم و فضل اور تقویٰ و طہارت کے گہوارے میں پلے۔

آپ حضرت فرزند علی صوفی منیریؒ کے فرزند اصغر اور جانشیں ہیں اور میرے والد محترم حضرت سید شاہ ایوب ابدالی نیرؔ اسلام پوریؒ کے والد محترم اور پیر و مرشد ہیں۔ آپ کی ولادت باسعادت ۱۲ صفر ۱۲۹۵ھ میں اپنی نانیہال اسلام پور میں ہوئی اور آپ کی ابتدائی تعلیم اپنے والد حضرت صوفی منیریؒ سے ہوئی۔ علوم دینیہ کی تعلیم حضرت مولانا حکیم سید محمد رفیق قادریؒ ابوالعلائیؒ سے ہوئی اور جب مزید شغف

لہ حضرت مولانا حکیم حاجی سید محمد رفیق قادری ابوالعلائی ابن سید فدا علیؒ کا وطن موضع شہباز پور علاقہ پن پن ضلع پٹنہ تھا۔ آپ نے مولانا آل احمد صاحب پھلواروی سے تحصیل علوم کیا اور آپ ہی سے سند حدیث حاصل کی۔ علم فقہ اور علم طب کی تعلیم مولانا حکیم سید غلام دستگیر سے پائی۔ آپ نے دونوں اساتذہ کرام سے ۱۲۹۰ھ میں (بقیہ اگلے صفحہ پر)

بڑھا تو آپ کانپور تشریف لے گئے، اور وہاں کے یگانہ روزگار عالم دین مولانا

(پچھلے صفحہ کا حاشیہ) سند فراغت حاصل کرلیا اور اپنے عہد کے مشہور صاحب فیض بزرگ حضرت سید شاہ ابوالعلائی سجادہ نشین خانقاہ اسلام پور کے دست حق پرست پر بیعت ہوئے اور اجازت وخلافت سے نوازے گئے۔ آپ فنافی الشیخ تھے کہ پیر و مرشد کی زندگی میں جن بزرگوں نے بھی آپ میں جوہر کامل دیکھ کر اجازت وخلافت دینی چاہی آپنے اسے قبول نہ کیا اور جواب میں آپ ہمیشہ یہی شعر پڑھتے۔ ؎

ہمہ شہر پرز خوباں منم وخیال ماہے
چہ کنم کہ نفس بدخو نکند بکس نگاہے

"یکدر گیر ومحکم گیر" کے اصول پر عمل کرتے رہے۔ اپنے پیر کے آستانے کی محبت میں اپنے وطن کو خیر باد کہہ کر اسلام پورہی کو اپنا ماویٰ وملجا اور وطن بنایا۔ اپنے پیرزادگان اور رئیس اسلام پور شاہ اکرام الدین احمد عرفان اسلام پوری کی تعلیم وتدریس میں مشغول رہے۔ جب آپ کے پیر و مرشد کا وصال سنہ ۱۳۰۱ھ میں ہوگیا تو آپ پر ایک عجیب کیفیت طاری رہی۔ تقریباً آٹھ سال بعد جب سکون حاصل ہوا تو سفر حج کے لیے سنہ ۱۳۰۹ھ میں روانہ ہوگئے۔ وہاں آپ کو حضرت مولانا عبدالحق مہاجر مکی رح، حضرت امداد اللہ مہاجر مکی رح، حضرت مولانا عبدالرحمن سراج مکی رح، حضرت سید امین الدین رح بن علامہ رضوان شیخ الدلائل مدرس حرم نبوی اور حضرت شیخ عبدالجلیل بن عبدالسلام برادہ مدنی رح سے سنہ ۱۳۱۰ھ میں مکہ مکرمہ اور مدینہ طیبہ میں سند حدیث حاصل ہوئی اور مختلف وظائف کی بھی اجازت ملی۔ نیز اجازت وخلافت سے بھی نوازے گئے۔ آپ عربی زبان وادب کے ماہر تھے۔ آپ کا فیضان بہت دور دور تک پہنچا۔ آپ کا وصال ۱۷ ربیع الآخر سنہ ۱۳۳۵ھ میں پٹنہ میں ہوا۔ اور اسلام پور میں اپنے پیر و مرشد کے مقبرے میں مدفون ہوئے۔ آپ کے مسند سجادگی پر آپ کے صاحبزادے حضرت حکیم محمد یسین علیہ الرحمہ رونق افروز ہوئے اور آپ کے بعد تمام مریدین ومعتقدین نے راقم الحروف کے والد حضرت ایوب ابدالی رحمۃ اللہ علیہ کو اصرار کرکے آپ کے مسند سجادگی پر بٹھایا۔ (بقیہ اگلے صفحہ پر)

احمد حسن کان پوریؒ سے حدیث وفقہ کی تعلیم کی تکمیل کر کے ان سے سند حدیث حاصل کی۔

تعلیم دینی کی تکمیل کے بعد تعلیم روحانی کی طرف متوجہ ہوئے اور اپنے والد حضرت سید شاہ فرزند علی صوفی منیریؒ کے دست حق پرست پر سلسلہ فردوسیہ میں بیعت ہوئے۔ آپ کے پیرو مرشد نے ریاضت و مجاہدہ اور اذکار و اشغال میں اس طرح مشغول کیا کہ اسی کے ہو کر رہ گئے کہ کچھ اپنی بھی خبر نہ رہی۔ گمنامی کا لبادہ اوڑھ کر اپنی بزرگی کو اس میں چھپائے رکھا۔

حضرت کو شعر و شاعری کا بھی ذوق تھا اور اپنے والد حضرت صوفی منیریؒ کی زندگی ہی میں طبع آزمائی کرتے تھے۔ لیکن اتنے پوشیدہ طور پر کہ والد کو بھی خبر نہ ہوئی۔ بلکہ ایک کیفیت آپ پر ایسی طاری ہوئی کہ سب کو منیر شریف کے تالاب میں جاکر غرق کر دیا۔ پھر اپنے والد کے وصال کے بعد ان کے شاگرد رشید حضرت عرفان اسلام پوری سے مشورۂ سخن لیا۔ آپ کی شاعری میں تصوف کا رنگ غالب ہے۔ وحدت الوجود اور وحدت الشہود کا مسلک تصوف میں بڑا اہم ہے۔ حضرت نے اس اہم نکتہ کو بڑے دل کش پیرائے میں پیش کیا ہے۔ ایک غزل کے چند اشعار ملاحظہ ہوں ؎

جس دل میں ترا گھر نہ ہو وہ دل خراب ہے
جو دل ہے محو یاد وہی کامیاب ہے

ہر شئی میں گو ہے اس کی تجلّی عیاں مگر
یہ غایتِ ظہور خود اس کا حجاب ہے

ہے مثلِ آفتاب عیاں بھی نہاں بھی ہے
عارض پہ تیرے فرطِ تجلّی نقاب ہے

(پچھلے صفحہ کا حاشیہ) حضرت ایوب ابدالی رحمۃ اللہ علیہ کی تعلیم و ارشاد آپ سے تھی اور اجازت و خلافت سے بھی نوازا تھا۔ حضرت موصوف نے اس فریضۂ رشد و ہدایت کو تاحیات انجام دیا۔ آپ کا وصال ۱۹۶۷ء میں ہوا۔

ہم میں وہ جلوہ گر ہے مگر دیکھیں کس طرح
اپنا وجود ہی تو سراسر حجاب ہے

مذکورہ بالا اشعار میں حضرت کامل اسلام پوری نے ہمہ اوست اور ہمہ ازوست کو اپنے شعری پیکر میں کس دل کشی اور کیف کے ساتھ پیش کیا ہے۔ اس کے علاوہ حضرت کامل اسلام پوری کی جتنی غزلیں ہیں سبھی میں ان کے واردات قلبی اور مشاہدات کی جلوہ سامانیاں ہیں۔ مزید ایک غزل پیش خدمت ہے، ملاحظہ ہو ؎

پھر وہ رشک گل تر یاد آیا — پھر وہ منظور نظر یاد آیا
حیف اس دل پہ ہے جس کو اے دوست — جز ترے کوئی اگر یاد آیا
بعد مدت کے چلے ہیں ناوک — آج پھر میرا جگر یاد آیا
اس کے سہنے کو بھی ہم ہیں تیار — کچھ ستم اور اگر یاد آیا
کعبہ یا دیر ہو شیدا کو ترے — ہر جگہ تیرا ہی در یاد آیا

کچھ بھی یاد اب دل کامل کو نہیں
تو جو یاد آیا اگر یاد آیا

آپ کا وصال ۶ جمادی الاول ۱۳۶۴ھ میں خانقاہ اسلام پور میں ہوا۔ آپ کا مزار مرجع خلائق ہے۔

وَلی سنڈوی ثم اسلام پوری

وَلی دکنی رنگ تغزل میں انفرادیت رکھتے ہیں تو وَلی سنڈوی کی اہمیت اردو رباعی میں نمایاں ہے۔ اخلاقی اور صوفیانہ رباعی کے علاوہ آپ کی غزلوں میں بھی تصوف کا رنگ و آہنگ ہے۔

آپ کا نام محمد ولی الحق اور وَلی تخلص ہے۔ آپ کے والد کا نام سید بیانت

حسین تھا اور آپ انشا پرداز بھی تھے۔ آپ کے بیشتر علمی مضامین رسالہ علی گڈھ (ماہانہ) میں شائع ہوئے ہیں جیسا کہ رخشاں ابدالی نے تحریر فرمایا ہے[1]۔ آپ کا وطن مالوف موضع سنڈہ ہے، جو اسلام پور سے دو میل کے فاصلے پر ہے اور اس کا شمار مضافات اسلام پور میں ہوتا ہے۔ آپ کی پیدائش ۱۲۹۶ھ مطابق ۱۸۸۵ء میں وطن مالوف ہی میں ہوئی۔ آپ نے مشرقی اور مغربی دونوں تعلیم حاصل کی۔ آئی۔ اے کے بعد آپ نے ٹریننگ حاصل کی۔ اور ایل ٹی کے امتحان میں کامیاب ہوئے۔ آپ سب سے پہلے خانقاہ اسکول، اسلام پور میں صدر مدرس رہے۔ اس کے بعد ڈپٹی انسپکٹر آف اسکولس کے عہدے پر فائز رہے۔ محکمۂ تعلیم کی ایما سے بعض کتابوں کے تالیف و ترجمہ کا کام بھی انجام دیا ہے۔ شاعری کا ذوق بچپن ہی سے تھا۔ حالی پانی پتی سے شرف تلمذ حاصل تھا۔ حضرت رخشاں ابدالی نے اپنے مضمون میں حالی پانی پتی کا ایک خط نقل کیا ہے جسے حالی نے جواباً مورخہ ۹ اگست ۱۹۱۴ء کو ارسال فرمایا تھا وہ درج ذیل ہے، حالی پانی پتی لکھتے ہیں:۔

"مخدومی! میرا حال شاید آپ کو معلوم نہیں میری آنکھ میں موتیا بند کا پانی اتر آیا تھا اور وہ قدح کے لائق ہو گئی تھی۔ اپریل میں پٹیالہ جا کر آنکھ بنوائی اور تقریباً ڈیڑھ مہینہ احتیاطاً وہیں بسر کیا۔ جون میں پانی پت آیا مگر ڈاکٹر کے حکم سے لکھنا پڑھنا اب تک بند ہے۔ کیوں کہ اب تک کوئی عینک آنکھ پر نہیں لگی۔ اور جب تک بنی ہوئی آنکھ کی عینک نہ ملے آنکھ پر زور ڈالنے کی ممانعت ہے اسی وجہ سے کوئی دماغی کام نہیں کر سکتا۔"

آپ کی رباعیاں دیکھ کر طبیعت بہت محظوظ ہوئی۔ اگرچہ ان میں دخل و تصرف کی گنجائش نہ تھی مگر امتثالاً الامر الشریف کہیں کہیں

---

[1] ندیم، جون ۱۹۳۵ء ص ۲۳ مقالہ ولی عظیم آبادی مرحوم

کلام میں زیادہ صفائی پیدا کرنے کے لیے کچھ الفاظ بدل دیئے ہیں
لیکن آپ کو معلوم رہے کہ اصلاحِ سخن کی خدمت سے میں ہمیشہ دُور
بھاگتا رہا ہوں، میرے نزدیک آپ جیسے سلیم الطبع اور صحیح الذوق
اصحاب کے لیے بہ نسبت اس کے کہ کسی دوسرے شخص سے مشورہ لیا جائے
بہ زیادہ بہتر ہے کہ خود اپنی طبیعت پر زور ڈالا جائے۔" [1]

ولی کے کلام کے خصوصیات ہیں اگر ایک طرف قومیت کا جذبہ ہے تو دوسری طرف اخلاقی شاعری بھی ہے۔ ان کے کلام میں رنگینیٔ تخیل بھی ہے اور مطالب عالیہ بھی۔ لیکن وہ حقیقت کے پرستار بھی ہیں اور جمالِ یار کے شیدائی بھی۔ وہ کہتے ہیں ؎

سو بار روئے یار سے پردا اُٹھے مگر
بے پردہ اس کو دیکھ سکے کس کی تاب ہے

تصوف میں اُمیدواریٔ رحمت کا جذبہ سب سے بڑا ہے۔ اس لیے اس کی آرزو کس کو نہیں؟ ولی اس خیال کو اس طرح پیش کرتے ہیں ؎

امیدوار نہ ہوں کیوں گناہگار ترے
نہ لے گی سایۂ دامن میں ان کو رحمت کیا

ولی کے کلام میں تصوف کا رنگ و آہنگ دونوں ہے۔ خدا کی توحید کو کتنے دل کش پیرائے میں پیش کرتے ہیں ؎

اے صاحبِ تاج کبریائی سُن لے — اے زینتِ تختِ خود نمائی سُن لے
فریاد ہر ایک دل کی سُننے والے — سُن لے سُن لے مری دُہائی سُن لے

ولی کے کلام میں مختلف کیفیتیں ہیں۔ جذبات و تخیل اور سلاست و روانی لطف زبان کا اثر اور انداز ہے۔ رخشاں ابدالی لکھتے ہیں ؎

"وہ شاعر ہیں اس لیے حسن و جمال کی پرستاری ان کا شیوہ

---

[1] ندیم، جون ۱۹۳۵ء صہ ۲۴

ہونا چاہئے لیکن وہ جمالِ حقیقت کے پرستار ہیں اور تجلی حقیقت نے اس درجہ وارفتہ و حیراں بنا دیا ہے کہ وہ کسی طرف نظر بھی نہیں اُٹھاتے۔ ان کے کلام میں غضب کا سوز و التہاب ہے اور اپنے کلام میں وہ شوق مجسم اور ایک بے قرار آرزو نظر آتے ہیں۔ جناب ولی کو زبان پر قدرت حاصل ہے۔ خیالات عمیق، نادر اور انوکھے ہیں۔ بندش کی چستی اور سلاست و روانی کا لطف بھی بدرجۂ اتم موجود ہے۔" [1]

ولی کی ایک غزل ملاحظہ کیجیے۔ جس میں تصوف کی چاشنی بھی ہے اور تغزل کی رنگینی بھی ؎

منظورِ چشم صورتِ جانانہ چاہئے
مرغوب گوشِ عشق کا افسانہ چاہئے

کیا چیز ہیں کہ سہل نہ ہوں مشکلاتِ غم
لیکن یہی کہ ہمتِ مردانہ چاہئے

فرزانگی پہ بار ہے ہنگامۂ حیات
دنیا میں بسے دل دیوانہ چاہئے

اس جادۂ فنا میں کہ رہبر ہے سوئے دوست
ہر ہر قدم پہ سجدۂ شکرانہ چاہئے

جلوے سے ہے غرض تو خزاں کیا بہار کیا
ہر رنگ میں نظارۂ جانانہ چاہئے

دعوائے عشق ہے تو ولی یہ سرِ نیاز
تسلیم آستانۂ جانانہ چاہئے [2]

ولی نے اس غزل میں بھی صوفیانہ جوہر دکھلائے ہیں، ملاحظہ ہو ؎

وفورِ شوق طلب نور رہنما اپنا
نوید جانِ طرب نالۂ رسا اپنا

فلک حریف، زمانہ عدو، زمیں دشمن
اس انجمن میں نہیں کوئی آشنا اپنا

وفا کے بندے، وفادار ہی گئے آخر
ہزار رنگ دکھاتی رہی جفا اپنا

چلا ہے تیری طرف ہائے کس تمنا سے
سرِ نیاز سے شوقِ سمندِ پا اپنا

---

[1] ندیم، جون ۱۹۳۵ء ص ۲۴

[2] تذکرۂ مسلم شعرائے بہار ص ۱۷۵ جلد پنجم

نہیں یہ موت کہ مرنا ہی زندگی ہے ولی
فنا کے دور میں ہے مرکزِ بقا اپنا [1]

۱۳۵۰ھ مطابق ۱۹۳۱ء میں آپ کا انتقال ہوا۔ آپ کا مجموعۂ کلام کتب خانہ خانقاہ اسلام پور میں بشکل مخطوطہ محفوظ ہے۔

---

[1] سبد گل مرتبہ رخشاں ابدالی ص ۳۰۷ (مخطوطہ)

عارف اسلام پوری

آپ کا اسم شریف امین الدین احمد اور عارف تخلص ہے۔ آپ کی ولادت باسعادت ۱۲۹۶ھ میں قصبۂ اسلام پور میں ہوئی۔ آپ شاہ اکرام الدین احمد عرفاں اسلام پوری کے برادر اصغر ہیں۔ آپ کے والد حاجی شاہ معین الدین احمدؒ جو حضرت مخدوم شاہ شعیب منیری رحمۃ اللہ علیہ کی اولاد میں سے ہیں۔ انھوں نے اپنی سسرال اسلام پور ہی میں مستقل بود و باش اختیار کی اور اپنے پیر و مرشد حضرت شاہ ولایت علی اسلام پوری علیہ الرحمہ سجادہ نشیں خانقاہ اسلام پور کے دامن اور آستانہ سے تا زندگی وابستہ رہے۔ یہی وجہ اسلام پور میں رہنے کی ہوئی۔ عارف اسلام پوری کی دینی تعلیم اپنے عہد کے جید عالم، طبیب حاذق اور ممتاز صوفی بزرگ حضرت مولانا حکیم حاجی سید محمد رفیق رحمۃ اللہ علیہ سے ہوئی۔ چونکہ حفظ قرآن کا بے حد شوق تھا، اس لیے عہد جوانی کے گذرنے کے بعد آغاز پیری میں قرآن مجید محنت و جانفشانی اور ذوق و لگن سے حفظ کیا اور جید حافظوں میں آپ کا شمار ہونے لگا۔ طبیعت میں اتباع شریعت رچی ہوئی تھی۔ صوم و صلوٰۃ کے ساتھ ساتھ اوراد و اذکار کے بھی پابند تھے۔

کتب بینی کا ذوق اچھا تھا۔ اس لیے آپ نے ایک اچھا اور گراں قدر کتب خانہ جمع کر لیا۔ دارالمصنفین اعظم گڈھ کے رکن اور انجمن ترقی اُردو ہند کے رکن دوامی تھے۔ تسلیم و رضا کے پیکر تھے۔ اس لیے کہ کبر سنی میں جوان اولاد نے داغ مفارقت دیا لیکن صبر و رضا کا دامن ہاتھ سے جانے نہ دیا۔ ان کا ایک واقعہ قابل درس و عبرت ہے جس کو حضرت رخشاں ابدالی نے اپنے مضمون میں تحریر فرمایا ہے:

"جناب عارف کے سکون قلب و دل جمعی کا اندازہ اس واقعہ سے ہوتا ہے کہ ۱۹۳۴ء کے بہار کے مشہور تاریخی زلزلے کے جھٹکے پر جھٹکے آ رہے ہیں۔ زلزلہ کی مہیب گڑ گڑاہٹ سے کان پڑی آواز سنائی نہیں دیتی ہے۔ زمین لرز رہی ہے اور قلب ہیں کہ دہلے جا رہے ہیں۔ ایسا معلوم ہوتا ہے کہ ساعت موعود آ پہنچی۔ یہ رمضان شریف کے دن تھے۔ ۲ ۱/۲ بجے دن کا وقت آپ تراویح کے لیے گڑھ اسلام پور کی جامع مسجد کے صحن میں قرآن مجید کا دورہ کر رہے تھے گھر کے لوگ کمروں اور مکانوں کو چھوڑ کر صحنوں اور کھلی جگہ پر نکل لئے ایسے میں کسی کو آپ کا خیال آیا۔ کوٹھے کو عبور کر کے آپ کے پاس مسجد میں جانے کی تو ہمت نہیں تھی۔ لوگوں نے آپ کو دور ہی سے پکارا کر مسجد سے نیچے چلے آئیے۔ مسجد کوٹھے پر ہے اور ہر چہار طرف عمارتیں ہی عمارتیں ہیں۔ مسجد کے بلند عظیم الشان مینارے جھوم رہے تھے اور بجائے خود مسجد اس وقت بے حد خطرناک جگہ تھی اس وقت بجائے اس کے کہ آپ مسجد سے باہر چلے آتے اور اُلٹے آپ صحن مسجد سے مسجد کے اندرونی حصے میں چلے گئے۔

جب سکون ہوا اور لوگوں نے آپ کو بتایا کہ آپ کا مسجد کو نہ چھوڑنا خود کو خطرے میں ڈالنا تھا تو آپ نے بہت اطمینان اور سکون کے ساتھ فرمایا کہ ایسے وقت میں اللہ کے گھر کو چھوڑ کر اور

کہیں جانے کا کیا موقع تھا ،" [1]

آپ حضرت شاہ ولایت علی اسلام پوری کے جانشین حضرت سید شاہ عبدالقادر ابدالی اسلام پوری سے مرید تھے اور کچھ ہی روز کے بعد صبح کے وقت اپنے پیرومرشد کی خانقاہ اسلام پور کے کتب خانہ قادریہ کو اپنا کتب خانہ نذر کردیا پھر وہ اپنی قیام گاہ پر تشریف لائے اور یکایک حرکت قلب بند ہو جانے سے انتقال ہوا۔ آخر محرم ۱۳۶۶ھ کا یہ واقعہ ہے اور نیر اسلام پوری کے پائیں میں مدفون ہوئے۔

شعروسخن کا مذاق آپ کا فطری تھا۔ اوائل میں خود ہی فکر سخن فرماتے لیکن بعد میں اپنے بڑے بھائی عرفاں اسلام پوری سے اصلاح سخن لیتے رہے۔ حالی پانی پتی سے بھی دو تین غزلوں پر اصلاح لی ہے اور ان کو وہ رنگ زیادہ پسند تھا لیکن آخر میں داغ دہلوی کا رنگ جو انہیں زیادہ پسند تھا اسی کی اتباع کرتے رہے۔ آپ کا ایک مجموعہ کلام دیوان کی شکل میں مرتب ہے مگر زیور طبع سے آراستہ نہیں ہوا ہے۔

عارف اسلام پوری حقیقت میں صوفی شاعر تھے ان کی غزلوں میں وہ رنگ زیادہ غالب ہے۔ رنگ تغزل پر بھی رنگ تصوف غالب ہے۔ عشق حقیقی کا اظہار اور ہمہ از دوست کا مسلک ان کی غزلوں میں بدرجہ اتم موجود ہے۔ ان کے کلام کے مطالعہ سے اس حقیقت کی ترجمانی ہوتی ہے۔ ایک غزل کے چند اشعار ملاحظہ کیجئے

ہر لحظہ تری ہی گفتگو ہے — ہر وقت تری ہی جستجو ہے
گلزار میں ہے بہار تیری — پھولوں میں ترا ہی رنگ و بو ہے
بلبل ترا نغمہ گا رہی ہے — کوئل بے تاب کو بہ کو ہے
ہر آنکھ کو ہے تری تمنّا — ہر دل میں تری ہی آرزو ہے
چکر میں پڑے ہیں ماہ و خورشید — ہر ذرّہ کو تیری جستجو ہے
اول آخر ہے تو ہی سب کچھ — ظاہر باطن جو کچھ ہے تو ہے

---

[1] حضرت عارف بہاری کا مقالہ درخشاں ابدالی مطبوعہ قومی زبان کراچی ۱۸ ستمبر ۱۹۴۸ء

مذکورہ بالا اشعار میں وحدت الشہود کے مسلک کو کتنے کیف آگیں انداز میں پیش کیا ہے۔ دوسری غزل کے بھی چند اشعار ملاحظہ ہوں جس میں صوفیانہ رنگ و آہنگ کو کتنے دلکش پیرائے میں پیش کیا ہے ؎

دین و مذہب سے ترے عاشق کو اب کیا کام ہے
وہ سمجھتا ہی نہیں کیا کفر کیا اسلام ہے

جتنا تیرا نام لوں اتنا بھی بھڑکے دل میں شوق
واہ واہ صلِّ علےٰ کیا خوب تیرا نام ہے

کوئی دیوانہ ہوا تو کوئی سولی پر چڑھا
سر فروشانِ محبّت کا یہی انجام ہے

عارفِ خستہ جگر شاباش کیا کہنا ترا
دل شکستہ ہے مگر لب پر اسی کا نام ہے

عارفؔ اسلام پوری نے اپنے صوفیانہ خیالات کو نت نئے انداز میں پیش کیا ہے شانِ خداوندی کو وہ کس انداز میں پیش کرتے ہیں، ملاحظہ ہو ؎

زیبا ہے تجھی کو سب زیبائی و رعنائی — کیا شان خدائی ہے کیا شان خود آرائی
کیسی ہے وہ زیبائی، کیسی ہے وہ رعنائی — جو ہے وہ ہے شیدائی جو ہے وہ تمنائی
دیکھو تو وہ ہے ہر سو ڈھونڈو تو نہیں ملتا — دیکھا نہ سنا ایسا، جیسا ہے وہ ہرجائی
ہر شان نرالی ہے، ہر بات نرالی ہے — کس کس کو کہے کوئی مجبور رہے گویائی

آنکھوں میں گزر کرنا اس دل میں اتر جانا
یہ کام ہے بس تیرا اے صورت زیبائی

حضرت شفیع بہاری رح

بہار شریف کی سرزمین مردم خیز بھی ہے اور گمنام پسند بھی اور سلسلہ فردوسیہ میں استغنا، عزلت گزینی اور گمنام پسندی محبوب روش ہے۔ حافظ سید شاہ محمد شفیع فردوسی اولاد مخدوم جہاں کے اعتبار سے اس پر عمل پیرا رہے۔ آپ مشہور بزرگ اور صوفی شاعر و سجادہ نشیں حضرت سید شاہ امین احمد فردوسی شوق بہاری کے فرزند ارجمند ہیں۔ آپ کا تخلص بھی شفیع تھا۔ آپ کی پیدائش ۱۲۹۶ھ میں بہار شریف محلہ خانقاہ میں ہوئی۔ عربی اور فارسی کی تعلیم اپنے والد بزرگوار سے حاصل کی اور ابتدا میں شعر و سخن کا ذوق فطری تھا۔ اس لیے ابتدا میں اصلاحِ سخن بھی اپنے والد بزرگوار ہی سے لیتے رہے اور آپ کے انتقال کے بعد استاد فن شاعر باکمال احقر بہاری سے اصلاحِ سخن لینے لگے۔ (احقر بہاری آزل لکھنوی کے شاگرد تھے اور وہ صبا کے اور صبا کے استاد ماہر فن آتش لکھنوی تھے۔ اس لیے اس طرح یہ دبستان لکھنؤ سے وابستہ تھے لیکن شعرائے بہار کی جو خصوصیت رہی ہے کہ دبستان لکھنؤ سے وابستہ رہتے ہوئے بھی وہ دبستان دلّی کے خصوصیات پر عمل پیرا رہے۔ شفیع بہاری اور ان کے استاد احقر بہاری تو اپنے صوفیانہ ماحول کی وجہ سے تصوف کے رنگ میں رنگ گئے۔ شفیع بہاری تو صوفی خانزادہ کے چشم و چراغ ہی تھے اس لیے ان کے کلام میں صوفیانہ خیالات کا در آنا فطری بات تھی۔ اگرچہ آپ کے کلام میں صفائی، روزمرہ کا استعمال، محاورہ بندی بدرجۂ اتم موجود ہے لیکن آپ کے اشعار میں زبان کی رنگارنگی اور تصوف کی چاشنی ہے خصوصیت کے ساتھ عشق حقیقی کا تو انداز ہی عجب ہے۔ ایک غزل کے چند اشعار ملاحظہ کیجئے اور دیکھئے کہ اس میں سوز و ساز ہے تو عشق کا انداز بھی ؎

اٹھتی تھی ٹیس دل میں دل درد سے بھرا تھا

جب عشق جاں ستاں تھا جینے کا اک مزا تھا

راہِ طلب میں لاکھوں پہلے رکاوٹیں تھیں

ہمت بڑھی جو آگے دو گام ماسوا تھا

زاہد سے روز محشر کہنا شفیعؔ میکش

عقبیٰ میں کیا ملے گا دنیا میں کیا ملا تھا

اور اس غزل کے بھی چند اشعار ملاحظہ کیجئے جس میں زبان کی چاشنی، عشق کی گھلاوٹ اور تصوف کا امتزاج ہے ؎

کھاپی کے بہت چین سے اوقات بسر کی | تھی عشق میں غم کی نہ کمی خونِ جگر کی
آخر یہ مہم بھی ترے جانباز نے سر کی | مشکل نظر آتا تھا گلا کاٹ کے مرنا
کھاتے ہیں کدھر کی تو بچاتے ہیں کدھر کی | حیران ہے دل ایک ہے چوٹیں ہیں ہزاروں
کم بخت کو اس پر بھی شکایت ہے اثر کی | پھر سُن کے مرا نالہ وہ گھبرا کے کہیں گے

یہ نالۂ مہجور ہے یا نغمۂ داؤد

ہلچل ہے شفیعؔ آج سرِ عرش اثر کی [1]

---

[1] تذکرہ مسلم شعرائے بہار حصہ دوم ص ۲۶۳

حضرت شاہ محسن ابوالعلائی داناپوریؒ

آپ حضرت شاہ محمد اکبر داناپوریؒ کے فرزند ارجمند اور جانشیں تھے۔ آپ کا نام محسن اور تخلص بھی محسن تھا۔ آپ کی ولادت باسعادت ۱۰ر جمادی الثانی ۱۲۹۰ھ میں داناپور میں ہوئی۔ آپ کی ابتدائی تعلیم والد ہی سے ہوئی۔ مزید حصول تعلیم کے لیے

آپ الہ آباد گئے۔ وہاں مدرسہ احیاء العلوم میں زیر تعلیم رہے اور وہیں سے فارغ التحصیل ہوئے۔ آپ کے اندر ابتدا میں سیاسی شعور بھی تھا۔ چنانچہ ۱۹۲۵ء میں پٹنہ میں مولانا شوکت علی اور سر علی امام بیرسٹر کی قیادت میں جب انجمن حفاظت المسلمین کا سہ روزہ جلسہ ہوا جس میں ہندوستان کے اکابر سیاسی رہنما شریک ہوئے تھے تو پہلے دن جلسہ کے صدر باتفاق آرا حضرت محسن دانا پوری منتخب کیے گئے۔ لیکن کچھ ہی دنوں کے بعد دنیاوی عز و جاہ سے کنارہ کش ہو کر ریاضت و مجاہدہ میں مشغول ہو گئے۔ اور اپنے والد ماجد حضرت سید شاہ محمد اکبر دانا پوریؒ کے دست حق پرست پر بیعت ہوئے اور اجازت و خلافت سے نوازے گئے۔ پھر ۱۶ شعبان ۱۳۲۷ھ کو آپ اپنے والد حضرت شاہ اکبر دانا پوریؒ کے وصال کے بعد مسند سجادگی پر رونق افروز ہوئے۔

آپ فطری شاعر تھے۔ قدرت نے آپ کو ذوق سلیم عطا فرمایا تھا۔ آپ اپنے والد شاہ اکبر دانا پوریؒ سے اصلاح سخن لیتے رہے۔ آپ چونکہ سلسلہ ابوالعلائیہ کے صاحب سجادہ تھے۔ جس کی تعلیم میں عشق حقیقی کی لپٹ اور درد و سوز کی آنچ ہے۔ اس لیے حضرت محسن کی شاعری میں بھی حقیقت و معرفت کے وہ تمام کوائف ہیں جن سے سالک دوچار ہوتا ہے۔ وحدت الوجود اور وحدت الشہود کے مسلک کو شاعر نے اپنے مخصوص انداز میں پیش کیا ہے۔ ملاحظہ ہو ؎

آئینہ سامنے رکھ کر یہ تماشا دیکھا — اپنی صورت میں ترے حسن کا جلوہ دیکھا

وہی عارف ہے وہی مرد خدا ہے محسن — جس نے قطرے میں ہی دریا کا تماشا دیکھا

اور ان اشعار میں حقائق کی جھلک دیکھئے۔ وحدت الشہود کے مسلک کو شاعرانہ انداز میں اس طرح پیش کرتے ہیں ؎

جمال یار ہر سو جلوہ گر ہے — جدھر دیکھا وہی پیش نظر ہے

کبھی آنکھوں میں وہ نور نظر ہے — کبھی دیکھا تو دل میں جلوہ گر ہے

عشق کی بھی عجب کیفیت ہوتی ہے اور وہ کہاں کہاں اثر انداز ہوتا ہے۔

اس غزل میں اس رنگ کو دیکھئے ـــ

اے دل پُر سرورِ من، ناز نہ بن، نیاز بن
ساقیٔ مست ناز کی آنکھوں میں سرفراز بن [4]

دیر و حرم سے درگزر، عاشقِ کبر و ناز بن
کعبۂ دل میں ڈھونڈھا اسے پردہ کشائے راز بن

جوششِ گریہ تا بکے، نالہ مکن مثالِ نے
یعنی تو اپنے درد کا آپ ہی چارہ ساز بن

دل میں ہے درد، درد میں مخفی ہے سوزِ عشق
مطرب خوش نوا بیا، پردہ درِ مجاز بن

خواہش و آرزو کو چھوڑ یعنی خوشی سے منہ نہ موڑ
نالۂ جاں گداز کر، عاشقِ دل نواز بن

کیف و سرور و بے خودی ساقی کی یاد لے گئی
آ دلِ غم گسارِ من، ساقیٔ مستِ ناز بن

آئینۂ علیؑ کو دیکھ، حسنِ محمدی کو دیکھ
کر کے نثار جان و تن، عاشقِ سرفراز بن

ہجر کی رات ہو بسر، کیسے بتا تو چارہ گر
آوے تصورِ سحر، بانگِ شبِ دراز بن

منبع نورِ ذات ہے، جلوہ گہہ صفات ہے
طالبِ حق بیا بیا، خاکِ رہِ مجاز بن

محسنؔ دل گرفتہ تو، کر نہ خودی کی گفتگو
بندۂ بے نیاز ہو، اکبرِ پاک باز بن

حضرت محسنؔ کی ایک غزل ہے جس میں رنگِ تغزل کے اثرات زیادہ ہیں

۴۔ تذکرۂ شعرائے بہار حصہ چہارم ۱۳۲ھ ۔ ۱۲۹

لیکن تصوف کو کتنی ایمائیت کے ساتھ پیش کیا ہے۔ ملاحظہ ہو ؎

خوشی سے دور ہوں نا آشنائے بزم عشرت ہوں
سراپا درد ہوں، وابستۂ زنجیرِ قسمت ہوں

حقیقت میں کوئی واقف نہیں میری حقیقت سے
معمہ ہوں کسی کا راز ہوں یا سرِ قدرت ہوں

کوئی سمجھے تو کیا سمجھے کوئی جانے تو کیا جانے
کسی کا عکس ہوں آئینہ دارِ بزم حیرت ہوں

گلستاں کی چمن آرائیوں سے مجھ کو کیا مطلب
کہ پابندِ قفس ہوں مبتلائے دردِ الفت ہوں

وہ دل ہوں وہ زباں ہوں جن میں گویائی نہیں گویا
مری ترکیب کہتی ہے کہ تصویرِ محبت ہوں

غضب کی چال گلشن میں چلا ہے باغبان محسن
اسی کا یہ نتیجہ ہے کہ پامالِ صعوبت ہوں [1]

---

[1] تذکرہ مسلم شعرائے بہار حصہ چہارم ص ۱۳۲

نور بہاری

بہار شریف عہد قدیم ہی سے صوفیائے کرام کا مسکن رہا ہے۔ ہر سلسلے کے بزرگانِ دین یہاں اپنا سشن لے کر آئے اور اخلاص و محبت کا درس دیتے رہے حضرت مخدوم جہاں شیخ شرف الدین یحییٰ منیری کی عظمت و بزرگی کے ساتھ ساتھ

علم باطنی کے فیضان نے تشنگانِ معرفت و طریقت کو دُور دُور سے کھینچ کر یہاں لایا۔ حضرت مخدوم کے زمانہ اور اس کے بعد ہر سلسلہ کے بزرگان دین یہاں پہنچنے لگے۔ سلسلہ زاہدیہ کے مشہور بزرگ حضرت شہاب الدین حق گو زاہدی کے پوتے حضرت پیر بدرالدین بدرعالم زاہدی بھی آٹھویں صدی ہجری میں چاٹگام سے بہار شریف تشریف لائے اور سلسلہ زاہدیہ کے مسلک اور تعلیمات کی ترویج و اشاعت میں منہمک ہوگئے۔ آپ کا خاندان بھی روحانی اعتبار سے بڑی عظمت و شہرت کا حامل ہے۔ حضرت پیر بدرعالم زاہدیؒ کی صاحبزادی ولیہ باکمال حضرت بی بی ابدالؒ بھی اپنی روحانی عظمت کے اعتبار سے مشہور ہوگئیں اور ان کی اولاد جوان ہی کی نسبت کی وجہ سے ابدالی کہی جاتی ہے، اپنے خاندانی اور روحانی بزرگوں کی سنت پر عمل پیرا رہی۔

نوؔر بہاری بھی اسی ابدالی خاندان کے ایک فرد ہیں۔ آپ کا نام نورالہدیٰ اور تخلص نوؔر ہے۔ تاریخی نام ظفر حسن ہے۔ بہار شریف کے محلہ رابور میں آپ کا آبائی وطن رہا۔ آپ کے والد ماجد حضرت سید لیاقت حسین ابدالی تھے اور صوفی منیریؒ کے شاگرد شاہ عطا کریم عطؔا بہاری کے آپ چھوٹے بھائی ہیں۔ آپ کا سنہ پیدائش ۱۲۹۸ھ ہے۔ آپ نجیب اور متمول خاندان کے فرد تھے۔ عربی فارسی تعلیم کے علاوہ آپ نے انگریزی میں ایف اے تک تعلیم حاصل کی تھی۔ آپ خانقاہ اسلام پور کے سجادہ نشین حضرت سید شاہ عبدالنقادر رحمۃ اللہ علیہ کے دست گرفتہ تھے۔ سماجی کاموں میں آگے آگے رہتے۔ جب آپ کے پیر و مرشد کی تمنّا خانقاہ اسکول قائم کرنے کی ہوئی تو آپ اس کے بانی مبانی ہوئے۔ اور پہلے خانقاہ مدرسہ اس کے بعد خانقاہ مڈل اسکول کی بنیاد ڈالی اور صدر مدرس کے فرائض بھی انجام دیتے رہے اس کے بعد وہ اسکول خانقاہ ہائی اسکول کی شکل میں بدل گیا۔ اصلاحی یا علمی کاموں میں انہوں نے اپنے خاندانی دولت کو بھی صرف کیا۔

نوؔر بہاری کو اُردو شاعری سے فطری ذوق تھا۔ نہایت ذہین و طباع تھے شروع میں کسی سے اصلاحِ سخن نہیں لیا لیکن اپنے بڑے بھائی عطؔا بہاری کے انتقال کے بعد

جب اصلاحِ سخن کا خیال آیا تو عرفاں اسلام پوری کی خدمت میں بغرضِ اصلاح دو تین غزلیں پیش کیں۔ عرفاں اسلام پوری نے اس کا بغور مطالعہ کیا اور یہ کہہ کر واپس کر دیا کہ آپ کو اصلاح کی ضرورت نہیں۔ آپ نے کثرت سے غزلیں کہی ہیں جس میں تصوف کا رنگ نمایاں ہے اس لیے کہ آپ صوفی مشرب بھی تھے۔ آپ کی بہت سی چیزیں ضائع ہو چکی ہیں بقیہ جو کچھ محفوظ ہیں وہ آپ کے نواسے ڈاکٹر ریحان غنی سلمہٗ کے پاس محفوظ ہیں جسے وہ دیوان کی شکل میں مرتب کر رہے ہیں۔

تصوف میں فضل خداوندی اور اس کی رحمت کی امیدواری بہت بڑی چیز ہے۔ شاعر موصوف نے اس خیال کو اس طرح پیش کیا ہے ؎

اپنی رحمت کو بھی وسعت دیجئے
بڑھتی جاتی ہے گنہگاری میری

اور ایک غزل کے چند اشعار ملاحظہ کیجئے ؎

مست جنّت میں گئے خانۂ خمار سے ہم ۔۔۔ گئے مے پیتے ہوئے عالمِ اسرار سے ہم
نذر لائے ہیں گہر، چشم گہر بار سے ہم ۔۔۔ رکھتے ہیں چشمِ کرم آپ کی سرکار سے ہم
اور محروم رہیں آپ کے دیدار سے ہم[1] ۔۔۔ سنگِ طور آپ کے جلووں سے سرافراز رہے

یہ دو شعر قابلِ غور ہیں اور اس میں حقیقت و آگہی کی کیسی کیفیت ہے ؎

تنگ تھے جینے سے مرنے کو ہوئے ہم تیار
بعد مرنے کے بھی سنتے ہیں کہ جینا ہوگا

زیست کہتے ہیں جسے موت ہے اپنی اے نور
موت کہتے ہیں جسے وہ مرا جینا ہوگا

نورؔ بہاری کی ایک غزل کے چند اشعار ملاحظہ کیجئے جس میں موصوف نے سیدھے سادے انداز میں حقائق و معارف کی نشان دہی کی ہے ؎

---

[1] تذکرہ مسلم شعرائے بہار حصہ پنجم ص ۹۵

قضا کی دیر ہے چلنے کو ہم تیار بیٹھے ہیں
گراں باریٔ تن سے کیا کریں ناچار بیٹھے ہیں
وہ ہم کو دیکھتے ہیں ہم کو دکھلائی نہیں دیتے
حجابِ بے حجابی ہے سرِ بازار بیٹھے ہیں
کرشمہ اپنی چشمِ مست کا دکھلا دے اے ساقی
یہاں ہم بھی بامیدِ مئے دیدار بیٹھے ہیں
خبر اپنی نہیں رکھتے، خبر غیروں کی کیا رکھیں
کہ عاشق ماسوا یار سے بیزار بیٹھے ہیں

حامد عظیم آبادی

دسویں[۱۰] صدی ہجری میں حضرت دیوان شاہ ارزاںؒ کی بزرگی اور عظمت کا شہرہ صوبہ بہار میں پھیل چکا تھا اور پہلے تکیہ دیوان شاہ ارزاںؒ کے نام سے یہ خطہ مشہور ہوا اور پھر خانقاہ کی شکل میں تبدیل ہو گیا۔ پٹنہ میں درگاہ شاہ ارزاںؒ سے کون واقف نہیں۔ وہاں کے سجادگان تجرد کی زندگی گذارتے ہیں۔ حامد عظیم آبادی بھی اسی خانقاہ کے سجادہ نشیں تھے۔ آپ کا اسم شریف حامد حسین اور تخلص حامد ہے۔ آپ کے والد سید شاہ واحد حسین تھے۔ آپ مرید و خلیفہ اپنے جدامجد حضرت سید شاہ حیدر علی صاحب سجادہ نشین درگاہ حضرت شاہ ارزاں کے تھے۔ ۱۳۱۶ھ میں سجادہ نشیں ہوئے۔ مسند سجادگی پر بیٹھ کر رشد و ہدایت بھی کرتے رہے۔ اور شعر و شاعری کے ذریعہ اپنے ذوق کی تسکین بھی۔ پروفیسر ذکی الحق صاحب نے اپنی تصنیف میں لکھا ہے:

"شعر و سخن کا ذوق اوائلِ عمر سے ہے۔ پہلے خواجہ شہرت عظیم آبادی سے

اصلاح لیتے تھے۔ پھر حضرت داغ دہلوی سے بذریعہ ڈاک اصلاح لی۔ جناب داغ کی وفات کے بعد حضرت احسن مارہروی کو اپنا کلام دکھاتے رہے۔ حضرت حامد کا ضخیم قلمی دیوان موجود ہے۔" [1]

حامد عظیم آبادی نے ۷ شعبان ۱۳۸۸ھ مطابق ۳ ستمبر ۱۹۶۷ء کو انتقال فرمایا اور درگاہ شاہ ارزاں میں مدفون ہوئے۔ آپ کے کلام پر تصوف کی چھاپ ہے۔ نمونہ کلام ملاحظہ ہو ؎

جلوہ تمہارے حسن کا بالائے طور تھا
وہ کس کا نور تھا اور وہ کس کا ظہور تھا

وسعتِ عالم میں کیا دیکھو گے ان آنکھوں سے تم
اس کا جلوہ دیکھنا ہو تو نظر پیدا کرو

کیوں نہ تصویر سے ظاہر ہو مصور کا وجود
تیری قدرت نے یقیں ہم کو دلایا تیرا

مذکورہ بالا اشعار میں مظاہر خداوندی اور مشاہدۂ جمال کو کس حسن و خوبی کے ساتھ پیش کیا ہے۔ حامد عظیم آبادی کی ایک غزل کے چند اشعار ہیں۔ جس میں اپنے مخصوص خیالات کو بھی پیش کیا ہے۔ ؎

کس کی ضیا ہے دل ہے منور فقیر کا
پر تو پڑا ہے کیا کسی روشن ضمیر کا

ہے باعثِ رضائے خدا عشق پیر کا
جا کر بچھے گا خلد میں بستر فقیر کا

حامد کوئی ستائے مجھے کیا مجال ہے
میں ہوں غلام حضرت پیران پیر کا

---

[1] ذکر و مطالعہ مرتبہ پروفیسر ذکی الحق ص

آپ کا مجموعۂ کلام ایک ضخیم کلیات کی شکل میں موجود ہے۔ جس میں چار سو غزلوں کے علاوہ مرثیہ، سلام، رباعیات اور قطعات ہیں لیکن وہ ابھی تک زیور طبع سے آراستہ نہیں ہوئے۔ عزیزی سید حسین احمد سلمہٗ جو اسی خاندان سے منسلک ہیں۔ تحریر کرتے ہیں کہ حامد عظیم آبادی کو مشاعرے کا از حد شوق تھا سال میں ایک مرتبہ کل ہند مشاعرہ منعقد کرتے تھے جس میں ہندوستان کے جید اور نامور شعراء شرکت فرماتے تھے۔ مثلاً سائل دہلوی، نوح ناروی، احسن مارہروی سیماب اکبرآبادی، امیر مینائی، جلال لکھنوی، عشرت لکھنوی، ضیا لکھنوی، کوثر خیرآبادی، اعظم کریوی، شمس لکھنوی، ساغر نظامی، وحید الہ آبادی وغیرہ باہر کے شعرا آتے، اس کے علاوہ صوبہ بہار کے بھی زیادہ تر شعراء شرکت فرماتے۔

حضرت مشرب اسلام پوری رح

آپ کا اسم شریف محمد ابوالبرکات اور تخلص مشرب ہے۔ آپ حضرت صوفی منیریؒ کے بڑے صاحبزادے محمد عبدالقادر کے خلف اکبر اور سجادہ نشیں ہیں۔ خاندانی اور روحانی عظمت کے حامل، آپ کی سنہ پیدائش ۱۳۱۶ھ ہے۔ آپ کی ابتدائی تعلیم سے عربی اور فارسی کی متوسطات تک اپنے استاد محترم حضرت مولانا الحاج سید محمد رفیق علیہ الرحمہ سے ہوئی اور کچھ فارسی تعلیم اپنے منجھلے چچا اور خسر حضرت حاجی حکیم سید شاہ محمد عمر عامر اسلام پوری سے حاصل کی۔

خانقاہ اسلام پور کی مسند سجادگی پر دادرشد و ہدایت دیتے رہے۔ کتب بینی کا گہرا ذوق تھا۔ ہر وقت عبادت و ریاضت یا مطالعہ کتب میں مشغول رہتے۔ شب بیداری آپ کا محبوب شغلہ تھا۔ ۱۷ ذی الحجہ ۱۳۸۹ھ مطابق ۲۴ فروری ۱۹۷۰ء بعد نماز ظہر آپ کا وصال اسلام پور میں ہوا اور

اپنے پیر و مرشد اور والد کے پہلو میں مدفون ہوئے۔

حضرت مشرب اسلام پوری فطری شاعر تھے، عرفاں اسلام پوری سے اصلاح سخن لیتے رہے اور داغ کا رنگ زیادہ غالب تھا۔ صوفیانہ مذاق رکھتے تھے۔ اس لیے شاعری میں بھی تصوف کا عنصر غالب ہے۔ نعت گوئی کا بھی گہرا ذوق رکھتے ہیں ویسے آپ کی شاعری میں تغزل کا بھی رنگ گہرا ہے لیکن صوفی شاعر کی حیثیت سے زیادہ نمایاں ہے۔ مشرب کی ایک غزل ملاحظہ کیجئے۔ ؎

کیا تو بھی تماشا ہے اے جلوۂ جانانہ — پردہ ہیں تو تُو خود ہے اور خلق ہے دیوانہ
تیری ہی تجلی ہے رونق رہِ کاشانہ — آباد تجھی سے ہے یہ عالم ویرانہ
ادراک سے برتر ہے عالم متحیر ہے — تو کون ہے کیا شئی ہے حیران ہے فرزانہ
جاں دادۂ الفت ہوں وابستہ گیسو ہوں — وارفتہ ہوں بیخود ہوں دیوانہ ہوں دیوانہ
دل میں ہے طلب تیری سر میں ہے ترا سودا — آنکھوں میں مرے تو ہے، مستانہ ہوں مستانہ
صوفی ہو برہمن ہو، یار ند خرابانی ق — کعبہ ہو کلیسا ہو، ہو شہر کہ ویرانہ
تو سب کی زباں پر ہے، جلوہ ہے ترا ہر جا — سب کھیل ہیں یہ تیرے اے جلوۂ جانانہ

اس مشرب خستہ کی بس اتنی تمنا ہے
اپنے سے شناسا کر، اغیار سے بیگانہ [۱]

مذکورہ بالا غزل میں حضرت مشرب اسلام پوری نے شان خداوندی کو کتنے دلکش پیرایہ میں پیش کیا ہے۔ مشرب کی دوسری غزل ملاحظہ ہو ؎

عجب بحر الفت تری شان ہے — جو موجہ ہے تیرا وہ طوفان ہے
یہ اک مشت خاک اور ہوا اس کا مظہر — یہ اس کا کرم، اس کا احسان ہے
پسند آئے تم کو، تو کیا چیز ہے — یہ جان حزیں تم پہ قربان ہے
بنایا ہے ذروں کو مہر منیر — عجب تیری قدرت عجب شان ہے
ہوا لطف یزداں کا مورد یہی — عجب قدرت حق یہ انسان ہے [۲]

[۱] سبد گل مرتبہ رخشاں ابدالی ص ۲۵۲ [۲] مجموعۂ کلام مشرب اسلام پوری (مخطوطہ)

حضرت شاہ قتیل دانا پوریؒ

خانقاہ دانا پور شاہ ٹولی، رشد و ہدایت کی وجہ سے منبع فیض ہے اور یہاں سلسلہ چشتیہ اور ابوالعلائیہ کے بزرگوں کا فیضان ہندوستان گیر ہوا۔ شاہ قتیل دانا پوریؒ بھی اسی خاندان کے چشم و چراغ ہیں۔

آپ کا اسم شریف محمد قائم اور قتیل تخلص ہے۔ آپ حضرت شاہ محمد حسین قادریؒ دانا پوری کے فرزند ارجمند ہیں۔ آپ کی ولادت باسعادت ۱۳۱۱ھ میں دانا پور میں ہوئی۔ آپ کی تعلیم پہلے تو دینی ہوئی اس کے بعد انگریزی تعلیم کی طرف متوجہ ہوئے۔ خاص کر ایسے وقت میں جبکہ صوفی خانوادہ میں انگریزی تعلیم معیوب تھی۔ حضرت موصوف نے انگریزی زبان و بیان پر بھی قدرت حاصل کی اور توریت و انجیل کا مطالعہ گہرے طور پر کیا۔ اسی لیے اپنی تقریریں توریت و انجیل کے حوالے کثرت سے دیتے۔ آپ ہندوستان گیر طور پر مقرر کی حیثیت سے مشہور و معروف تھے۔ تقریباً پورے ہندوستان میں سیرت پاک کے جلسوں میں آپ مقرر کی حیثیت سے مدعو کیے جاتے۔ آپ کی تقریریں مدلل، پرکیف اور پُرتاثیر ہوتیں۔

آپ اپنے والد پیر و مرشد حضرت سید شاہ محمد شرف الدین حسینی چشتی نظامی قدس سرہٗ کے دست حق پرست پر ۱۳۴۲ھ میں بیعت سے مشرف ہوئے اور مرید کو بامراد دیکھ کر اجازت و خلافت سے نوازا اور اپنی سجادگی عطا فرمائی۔

حضرت قتیل دانا پوریؒ نے ورثے میں شاعری کا فطری ذوق پایا تھا۔ صوفیانہ ماحول کی اثر آفرینی نے بھی آپ کے دل کو سوز و گداز سے معمور کر دیا۔

پہلے زبان فارسی میں شاعری کرتے تھے پھر اُردو میں طبع آزمائی کرنے لگے۔ اور "تجلیاتِ قتیلؔ" دیوان اُردو کے نام سے آپ کا مجموعہ کلام ہے۔ آپ صفیرؔ بلگرامی کے شاگرد سید امیر حسن بدرؔ آروی کے سلسلۂ تلمذ میں آئے اور آپ ہی سے اصلاحِ سخن لیتے رہے۔ آپ استادِ فن تھے۔ حمد و نعت کے علاوہ غزل میں بھی آپ کا مخصوص رنگ ہے۔ لیکن آپ کے کلام میں تصوف کا گہرا رنگ و آہنگ ہے۔ ملاحظہ ہو ؂

مکیں ہو جاؤ تم جس میں وہ دل ویراں نہیں ہوتا
مقید جس میں یوسف ہو وہ گھر زنداں نہیں ہوتا
نہ ہو پیدا بشر میں حُسنِ خلق آدمی جب تک
مَلک ہو جائے ممکن ہے مگر انساں نہیں ہوتا

حضرت قتیلؔ اپنے کلام میں تصوف کے ان نکات کو پیش کرتے ہیں جو قدرت خداوندی کا آئینہ دار ہے۔ چند اشعار ملاحظہ کیجئے۔

صدف کو بحر میں گوہر، گلوں کو زر گلستاں میں
تماشا فضل کا تیرے، کرشمہ تیری قدرت کا
کفِ قاتل میں آکر ہو گئی، شمشیر بھی خونی
اثر دُنیا میں ہو کر ہی رہا کرتا ہے صحبت کا
کہاں وہ قطرۂ نیساں، کہاں دُرجِ صدف یارب
کہیں بھی ہو پہنچ جاتا ہے دانہ مُنھ میں قسمت کا

آسمان شاعری کا یہ تابندہ ستارہ ۱۳۷۱ھ میں اپنے مالکِ حقیقی سے جا ملا۔ آپ کا مزار پُرانوار داناپور میں مرجع خلائق ہے۔

حضرت صبیح عظیم آبادی رح

خانقاہ عمادیہ منگل تالاب پٹنہ سیٹی، صوبہ بہار کی ایک باعظمت خانقاہ ہے۔ جس کے سجادگان علم وفضل کے ساتھ ساتھ شعر وسخن کا بھی ذوق رکھتے تھے۔ شاہ صبیح عظیم آبادی اسی خاندان کے چشم وچراغ ہیں اور اسی خانقاہ کے سجادہ نشین بھی۔

آپ کا اسم گرامی صبیح الحق اور تخلص صبیح ہے۔ آپ حضرت مولانا شاہ محمد حبیب الحق کے صاحبزادے اور شوق بہاری کے نواسے ہیں۔ آپ کی ولادت ۱۳۱۹ھ مطابق سنہ ۱۹۰۱ء کو خانقاہ عمادیہ قلندریہ منگل تالاب پٹنہ سیٹی میں ہوئی۔ آپ کی ابتدائی تعلیم حضرت شاہ رشید الحق کے آغوش شفقت میں ہوئی۔ درسیات کی ابتدائی کتابیں اپنے والد ماجد سے پڑھیں۔ چند سال مدرسہ شمس الہدیٰ میں بھی زیر تعلیم رہے۔ پھر مدرسہ سبحانیہ الہ آباد چلے گئے۔ مدرسہ الٰہیات کان پور میں مولانا آزاد سبحانی کے زیر تعلیم رہے۔

آپ کا ذوق شعری فطری تھا۔ آپ کو شاعری میں حضرت علامہ تمنا عمادی سے شرف تلمذ حاصل تھا۔ آپ کے کلام میں صوفیانہ مذاق ہے۔ آپ کے صاحبزادے متین عمادی لکھتے ہیں:-

> آپ کے کلام میں برجستگی، زبان کی لطافت اور مضمون آفرینی پائی جاتی ہے۔ چونکہ خاندانی طور پر تصوف کے منازل سے آشنا تھے اس لیے کلام پر تصوف کی چھاپ گہری ہے۔ زبان وبیان کے لحاظ سے

داغ کو پسند فرماتے تھے لہٰذا زبان کی لطافت وپاکیزگی بھی پائی جاتی ہے۔" ۵ؔ

آپ کا وصال ۲۴ محرم ۱۳۹۵ھ مطابق ۷ فروری ۱۹۷۵ء کو خانقاہ عمادیہ منگل تالاب پٹنہ سیٹی میں ہوا اور پھلواری شریف لعل میاں کی درگاہ میں مدفون ہوئے۔

حضرت شاہ صبیح صوفی شاعر تھے۔ خاندانی ماحول مسند سجادگی کی اثر پذیری اور خود آپ کا فطری صوفیانہ مزاج۔ ان اثرات نے مل کر آپ کی شاعری کو تصوف کی گہری چھاپ بخشی۔ میرے اس دعوے کی دلیل، آپ کی غزل کے یہ اشعار ہیں۔ ملاحظہ کیجیے

۵ؔ خاکساری سے ملا کرتا ہے رتبہ کیسا
کس کی عزت کو پہنچ جاتا ہے سرمہ کیسا
ہم غلامانِ محبت اسے کیا جانیں دلا
دیر کہتے ہیں کسے اور ہے کعبہ کیسا
جان کو روگ محبت کا لگایا ہم نے
ہائے دل دے کے خریدا ہے یہ سودا کیسا
ہو جو انسان صبیح تو ہے خطا بھی لازم
تم کو کی صحت کا ہے یہ دعویٰ کیسا

مذکورہ بالا اشعار میں زبان کی شیرینی اور تصوف کی بھی چاشنی ہے اور اس غزل کے چند اشعار بھی ملاحظہ کیجئے جس میں تصوف کے مختلف حقائق پر روشنی ڈالی گئی ہے ۵ؔ

جس کو تری تلاش تری جستجو نہ ہو
رسوائے دہر در بدر و کو بہ کو نہ ہو
اے بدنصیب قلب جو پہلو میں تو نہ ہو
بر ابتلائے کش مکش آرزو نہ ہو

۵ؔ نقوش صبیح مرتبہ متین احمد عمادی ص ۵

قبلے کا رُخ جو ہو نہ ترے آستاں کی سمت
وقت نماز کوئی کہیں قبلہ رُو نہ ہو
ہم بھی گناہ کرنے کی عادت کو چھوڑ دیں
پروردگار تجھ میں جو بخشش کی خو نہ ہو
اس وقت فکر چاہئے عصیاں کو اے صبیح
قرآں میں جب آیت لاتقنطوا نہ ہو [۱]

حضرت نیرّ ابدالی اِسلام پوری [7]

حضرت نیر ابدالی اسلام پوری اپنے خاندانی اور روحانی اعتبار سے صوفیٔ باصفا بھی تھے اور شاعر بلند پایہ بھی۔ آپ حضرت صوفی منیری کے چھوٹے صاحبزادے شاہ سید علی کامل اسلام پوری کے بڑے صاحبزادے تھے۔ دادا بھی صوفی شاعر تھے اور والد بھی۔ اس لیے یہ ذوقِ شعری اپنے بزرگوں سے وراثتاً ملی تھی۔ آپ کا اسم شریف محمد ایوب ابدالی اور تخلص نیرّ ہے۔ آپ اپنی ننہیال خانقاہ بلخیہ فردوسیہ فتوحہ ضلع پٹنہ میں ۱۳۲۴ھ میں پیدا ہوئے۔ آپ کا تاریخی نام "منظور حسین" ہے۔ آپ نے ابتدائی تعلیم اپنے والد ماجد سے حاصل کی۔ اس کے بعد حضرت مولانا محمد رفیق رحمۃ اللہ علیہ کے زیر تعلیم رہے۔ ۱۳۳۳ھ میں مدرسہ دار العلوم محلہ رنگیاں کانپور میں مولانا مشتاق احمد ابن مولانا احمد حسن کانپوری سے عربی کی تعلیم حاصل کی۔ آخر میں آپ نے مولانا سخاوت حسین سے علم حدیث حاصل کیا۔ اور سند بھی حاصل کی

---

[۱] نقوشِ صبیح: مرتبہ، متین عمادی ص ۱۰۲

(مولانا سخاوت حسین مولانا احمد علی محدث سہارن پوری کے شاگرد تھے۔) اور حضرت مولانا فضل رحمان گنج مرادآبادی کے مرید و خلیفہ۔ آپ کو فن حرب و ضرب کا جب ذوق پیدا ہوا تو مولانا سید سلیمان ندوی کے والد حضرت حکیم ابوالحسن سہروردی سے یہ فن سیکھا۔ (حکیم ابوالحسن علیہ الرحمہ حضرت سید شاہ ولایت علی اسلام پوری کے مرید و مجاز تھے اور فن شمشیر زنی میں رستم خاں لکھنوی کے شاگرد تھے)

آپ اپنے والد و مرشد کے مرید و مجاز تھے۔ آپ میں شاعری کا فطری ذوق تھا۔ حضرت عرفاں اسلام پوری سے مشورۂ سخن کرتے اور ان کے تلامذہ میں آپ کو شاگرد رشید تسلیم کیا جاتا اس لیے کہ کبھی کبھی ایسا بھی ہوا ہے کہ عرس کے بعد شاعرہ کے لیے جو مصرع کے لیے جو مصرع طرح دیا گیا اس میں استاد اور شاگرد دونوں کا شعر بالکل زبان و خیال کے اعتبار سے مشابہ ہو جاتا۔ اصلاح کے وقت عرفاں اسلام پوری کہتے کہ جو شعر آپ نے کہا ہے وہی میں نے بھی کہا ہے اور اس کے بعد اس کو سناتے۔ نیرؔ اسلام پوری اگرچہ غالب اسکول کے پروردہ تھے۔ اس لیے کہ خود آپ کے دادا حضرت صوفی منیریؔ غالب کے شاگرد تھے لیکن اپنے استاد عرفاں اسلام پوری کے رنگ و آہنگ کی وجہ سے داغ دہلوی کا انداز زیادہ چھا گیا اور ایسا معلوم ہوتا ہے کہ صوبۂ بہار میں اس عہد میں داغؔ کے شاگردان کی تعداد زیادہ تھی اس لیے زبان و بیان میں وہی رنگ مقبول تھا۔ لیکن نیرؔ کا جو صوفیانہ مزاج ہے اس کے اعتبار سے ان کی شاعری میں تصوف کا رنگ و آہنگ غالب رہا۔ نیرؔ کی غزلوں میں تغزل کا رنگ تو ہے ہی لیکن تقریباً تمام غزلوں میں تین چار اشعار تصوف کے بھی صاف جھلکتے ہیں۔ عمر دالی رحمت کا تیور اس شعر میں دیکھیے ؎

حشر میں کون ہے بڑھتا دیکھوں
یہ گنہ میرے کہ رحمت تیری

اور اس شعر کو بھی ملاحظہ کیجیے ؎

اے خدا ہم کو نہ رکھ اپنے کرم سے محروم
زندہ بس اک تیرے امیدِ کرم پہ ہم ہیں

زور قضا اور تسلیم و رضا کا حصہ تصوف میں نمایاں ہے۔ نیر کو اس رنگ میں دیکھئے ؎

تدبیر کروں وصل کی اب کیا میں الہٰی
بندہ کا تو چلتا نہیں کچھ زور قضا سے

بے چین ہوں یارب میں غم و رنج و بلا سے
کچھ حصہ تو دے مجھے تسلیم و رضا سے

عشق: حقیقی تصوف کا ایک اہم نکتہ ہے جس پر گویا صوفیانہ شاعری کی بنیاد ہے۔ فارسی شاعری میں تو اس موضوع پر نہ جانے کتنے انداز میں اشعار کہے گئے ہیں اردو غزل بھی اس سے محروم نہیں ہے۔ نیر نے اس موضوع پر اظہار خیال کیا ہے۔ ان کے انداز کا اچھوتا پن ملاحظہ کیجئے ؎

کیا دل نہ ہو جس میں تمنائے محبت ۔۔۔ کیا سر ہے وہ جس میں نہ ہو سودائے محبت
کونین کی قیمت سے فزوں کیوں نہ وہ دل ہو ۔۔۔ ہو جلوہ فگن جس میں تجلائے محبت

اولیں شرط عاشقی یہ ہے
جان دینے کو ابتدا جانے

اب نیر کی اس غزل میں تصوف کی چاشنی ملاحظہ کیجئے ؎

اُلفت میں تری جو مر گیا ہوں ۔۔۔ آپ اپنے میں درد کی دوا ہوں
کیا چاہوں بجز ترے الہٰی ۔۔۔ بس تجھ سے تجھی کو چاہتا ہوں
بس ایک یہی ہے جُرم میرا ۔۔۔ سو جان سے آپ پر فدا ہوں
گو تیری رہِ طلب میں جوں خاک ۔۔۔ میں سُرمۂ دیدۂ صبا ہوں

دل میں ہے خیال نیر
میں محوِ جمال دل رُبا ہوں

نیر کی دوسری غزل بھی ملاحظہ کیجئے جس میں آہنگِ تصوف بھی ہے اور رنگِ

تغزّل بھی ؎

کون کس کا ہے کس کو اُلفت ہے
اپنے مطلب کی ساری خلقت ہے

کوئی للہ مجھ کو یہ تو بتائے
ان سے ملنے کی کوئی صورت ہے

ہم دمو! کیا کہوں میں حال اپنا
کچھ نہ پوچھو جو میری حالت ہے

ذرّے ذرّے میں مہر کا جلوہ
دیکھے جو صاحب بصیرت ہے

وہ کرم تو کریں گے کیا مُجھ پر
یاد رکھیں یہی غنیمت ہے

ہے یہی کارخانۂ عالم
کہیں غم ہے کہیں مسرت ہے

قیدِ دُنیا سے ہم ہوئے جو رہا
اے اجل یہ تری بدولت ہے

حشر میں وہ منا رہے ہیں مجھے
عید سے بڑھ کے یہ قیامت ہے

دل تو اب ہم لگا چکے نیرؔ
آگے اللہ کی مشیّت ہے

حضرت نیرؔ اسلام پوری کا وصال ۳ رجب المرجب ۱۳۸۷ھ مطابق ۱۹۶۷ء کو اسلام پور ہی میں ہوا اور وہیں اپنے والد اور پیر و مرشد حضرت سید شاہ علی رحؒ کے بغل میں مدفون ہوئے۔

آپ کا عرس ۳ رجب المرجب کو ہر سال ہوا کرتا ہے، جس میں ہندوستان کے مختلف صوبوں سے متوسلین شریکِ عرس ہوتے ہیں۔ آپ کا مزار مبارک مرجع خلائق ہے۔

حضرت نازش شہرامی رح

حضرت نازش شہرامیؒ کے مورث اعلیٰ حضرت امیر کبیر قطب الدین مدنی الحسنیؒ بادشاہ قطب الدین ایبک کے عہدِ حکومت میں ہندوستان آئے، اور سرگرم جہاد رہے۔ آپ حضرت نجم الدین کبریٰ ولی تراشؒ کے مرید و مجاز تھے اس لیے رشد و ہدایت کے فریضے کو بھی انجام دیتے رہے۔ آپ کے اخلاف بدایوں اور مشرقی یوپی ہوتے ہوئے صوبہ بہار بھی پہنچے۔ چنانچہ حضرت نازش شہرامی کے دادا حضرت قاضی وحید الحقؒ ان ہی کی اولاد میں ہیں۔ آپ صوبہ بہار کے مشہور صاحب نسبت بزرگ حضرت شاہ قیام اصدق چشتیؒ پیر بیگہ ضلع نالندہ کے دست حق پرست پر بیعت ہوئے اور پیر و مرشد نے مرید کو بامراد کر کے اجازت و خلافت سے نوازا۔ پھر آپ کے صاحبزادے حضرت شاہ وصی الحق مسکین شہرامیؒ بھی حضرت شاہ قیام اصدقیؒ کے صاحبزادے اور جانشین حضرت شاہ شہود الحقؒ سے مرید ہوئے اور آپ کو خلافت عطا کی گئی اور رشد و ہدایت کی وسعت کی تلقین کی گئی۔ آپ نے مسند رشد و ہدایت پر جلوہ افروز ہو کر ایک جہان کی رہبری و رہنمائی کی۔ نازش شہرامی آپ ہی کے فرزند ارجمند اور جانشین ہیں۔

حضرت نازش شہرامیؒ کا اسم شریف محمد انوار الحق اور تخلص نازش ہے۔ آپ کی ولادت باسعادت ۱۹۱۵ء میں ہوئی اور آپ کی تعلیم مدرسہ سبحانیہ الہ آباد اور جامعہ نعیمیہ مراد آباد میں ہوئی۔ لیکن تکمیل تعلیم مدرسہ فیض الغربا آرہ میں ہوئی۔ آپ فراغت تعلیم کے بعد خود بھی درس و تدریس میں مشغول ہو گئے۔ آپ اپنے والد و مرشد حضرت شاہ وصی الحقؒ سے مرید ہوئے اور تعلیم روحانی کے بعد

پیر و مرشد نے آپ کو اپنی مسند سجادگی پر بٹھایا اور رشد و ہدایت کی ذمہ داری سونپی۔ شاعری کا ذوق ورثہ میں ملا تھا۔ لیکن رنگ تغزل میں جگر مرادآبادی کا رنگ پسند آیا اور آپ نے جگر مرادآبادی ہی سے سلسلۂ تلمذ کا رشتہ قائم کیا۔ جگر نے بھی اپنے اس شاگرد میں جوہر قابل دیکھا تو ان پر خصوصی توجہ دی۔ خود حضرت نازش شہرامی عشقِ مجازی اور عشقِ حقیقی کی دھیمی دھیمی آنچ میں سلگ رہے تھے اور اس کے اظہار کا وسیلہ صوفیانہ شاعری تھی۔ چنانچہ عشق کے اس سوز و گداز کو نازش کے ان اشعار میں دیکھیے ؎

آنکھوں کی آرزو جدا، دل کا الگ پیام ہے
لذتِ درد بانٹیے، غم ابھی تشنہ کام ہے
رفعتِ بندگی نہ کھو، سجدوں کا اک مقام ہے
بتکدۂ ہوس کا اب کعبۂ عشق نام ہے
وقت کا آسرا غلط، کاوشِ این و آں غلط
جراتِ عشق چاہیے، آگے خدا کا نام ہے

نازش شہرامی کے عشق میں والہانہ پن نہیں بلکہ جراتِ رندانہ ہے۔ ان کے یہاں درد و الم بھی ہے اور کیف و کم بھی، لیکن دعوتِ فکر و عمل کا پُرکیف اندازِ بیان ہے۔ ایک غزل کے چند اشعار ملاحظہ کیجیے ؎

بے کراں لذتِ پیکاں بھی نہاں رکھتے ہیں
یعنی ہم کارگہہ شیشہ گراں رکھتے ہیں
راہ چلتے ہیں دھندلکوں میں بھٹک جاتے ہیں
لوگ آوارگیٔ شوق کہاں رکھتے ہیں
وقت کا ساز انھیں راس کہاں آتا ہے
اپنا آئینہ الگ خود نگراں رکھتے ہیں

چھیڑا ہے دشتِ بلا شوق سے طوفانوں کو
پاسِ ناموسِ جنوں زندہ دلاں رکھتے ہیں
اور تو حضرتِ نازش میں کوئی بات نہیں
ہاں مگر ایک الگ طرزِ فغاں رکھتے ہیں

آپ کا وصال ۲۵ ربیع الاول ۱۴۰۵ھ مطابق ۱۹۸۳ء میں ہوا۔ اور آپ کا مزار مبارک شہسرام میں زیارت گاہ خاص و عام ہے۔

کتابیات

۱۔ آئین اکبری مصنف ابوالفضل مرتبہ سید احمد خاں

۲۔ اردو شہ پارے حصہ اول مولفہ محی الدین قادری زور

۳۔ اردو کی ابتدائی نشو و نما میں صوفیائے کرام کا کام مصنفہ عبدالحق

۴۔ اردو میں صوفیانہ شاعری مصنفہ ڈاکٹر محمد طیب ابدالی

۵۔ اردوئے قدیم مصنفہ شمس اللہ قادری

۶۔ اصل المقصود مصنفہ شاہ تراب علی قلندرؒ

۷۔ الرسالہ قشیریہ مصنفہ امام قشیری

۸۔ بہار میں اردو زبان و ادب کا ارتقاء مصنفہ ڈاکٹر اختر احمد اورینوی

۹۔ تحقیقی مقالہ مصنفہ ڈاکٹر کلیم احمد عاجز (مخطوطہ)

۱۰۔ تذکرۂ شورش مرتبہ ڈاکٹر محمود الہٰی

۱۱۔ تذکرہ مسلم شعرائے بہار مصنفہ احمد اللہ ندوی

۱۲۔ تصوف اسلام مصنفہ عبدالماجد دریا بادی

۱۳۔ حرفِ تمنّا مرتبہ ڈاکٹر حسین الحق

۱۴۔ حضرت صوفی منیری کے نثری کارنامے مصنفہ ڈاکٹر محمد طیب ابدالی

۱۵۔ حیات شیخ عبدالحق محدث دہلویؒ مصنفہ خلیق احمد نظامی

۱۶۔ خم خانۂ تصوف مصنفہ ظہور الحسن شارب ردولوی

۱۷۔ خواجہ میر درد تصوف اور شاعری مصنفہ ڈاکٹر وحید اختر

۱۸۔ ذکر و مطالعہ مرتبہ پروفیسر ذکی الحق

۱۹۔ رسالہ زبان و ادب بہار اردو اکادمی پٹنہ

۲۰۔ سبد گل مرتبہ رخشاں ابدالی (مخطوطہ)

۲۱۔ سفینۃ الاولیاء مصنفہ شہزادہ دارا شکوہ

۲۲۔ سیر الاولیاء ملفوظ حضرت محبوب الٰہیؒ جامع امیر خوردؒ

۲۳۔ شرح آداب المریدین مصنفہ حضرت شیخ شرف الدین یحییٰ منیریؒ (مخطوطہ)

۲۴۔ ضیاء القلوب — ملفوظ حضرت سید احمد چرم پوش رح

۲۵۔ عوارف المعارف — مصنف حضرت شیخ الشیوخ شہاب الدین سہروردی رح

۲۶۔ فانی کی شاعری — مصنف ڈاکٹر ظہیر احمد صدیقی

۲۷۔ کتاب اللمع — مصنف حضرت شیخ ابو نصر سراج رح

۲۸۔ کشف المحجوب — مصنف شیخ عثمان علی ہجویری رح

۲۹۔ کنز الانساب — مصنف حضرت کبیر الدین رح

۳۰۔ گلزار ابرار — مصنف غوثی شطاری رح

۳۱۔ مجموعہ کلام مشرب اسلام پوری (مخطوط)

۳۲۔ مذہب اور شاعری — مصنف ڈاکٹر اعجاز حسین

۳۳۔ مرزا محمد علی فدوی حیات اور شاعری، مصنف ڈاکٹر سید محمد حسنین

۳۴۔ مسالک السالکین — مصنف مرزا محمد عبدالستار بیگ سہرامی

۳۵۔ مسائل تصوف — مصنف میکش اکبر آبادی

۳۶۔ مسلم شعرائے بہار — مصنف احمد اللہ ندوی

۳۷۔ معدن الاسرار — ملفوظ حضرت قاضی علا شطاری رح (مخطوط)

۳۸۔ معدن المعانی — ملفوظ حضرت شیخ شرف الدین یحییٰ منیری رح

۳۹۔ معراج العاشقین — مصنف ڈا حضرت بندہ نواز گیسو دراز

۴۰۔ مکتوبات صدی — مصنف حضرت شیخ شرف الدین احمد یحییٰ منیری رح

۴۱۔ مناقب الاصفیاء — مصنف حضرت مخدوم شاہ شعیب رح

۴۲۔ مناہج الشطار (مخطوط) مصنف حضرت مخدوم رکن الدین جندھوی رح

۴۳۔ نسب نامہ فیض الرسل — مصنف سید فیض علی (مخطوط)

۴۴۔ نفحات الانس — مصنف عبدالرحمان جامی رح

۴۵۔ نقوش صبیح — مرتبہ متین احمد عمادی

۴۶۔ رسالہ ندیم، گیا، جون ۱۹۳۵ء

۴۷۔ وسیلہ شرف، ذریعہ دولت — مرتبہ ڈاکٹر محمد طیب ابدالی

۴۸۔ یادگار عشق — مصنف ثاقب عظیم آبادی